پتھر کی دیوار

علی سردار جعفری

پتھر کی دیوار

پہلی بار — اگست سنہ ۱۹۵۳ء
تعداد اشاعت — ایک ہزار
قیمت — دو روپے آٹھ آنے

(لکھنؤ لیتھو پریس دہلی)

پتّھر کی دیوار

سردار جعفری

مکتبہ شاہراہ دہلی

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

حافظ شیرازی

سجّاد ظہیرؔ اور فیضؔ کے نام

فہرست

زنداں بہ زنداں،
خونیں ہاتھ،
بھوکی ماں بھوکا بچہ،
آخری رات،
کوریا،
فیض کے نام،
سجاد ظہیر کے نام،
یلغار،
متفرقات،

اردو

غزل
اناج
غزل
تہنیت
پیامِ کشمیر
حسنِ کشمیر
جہلم کا ترانہ

حرفِ اوّل

"پتھر کی دیوار" میری جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں اب میں نے بعد کی کہی ہوئی کچھ اور نظمیں بھی شامل کرلی ہیں "ایشیا جاگ اُٹھا" اور "امن کا ستارہ" کی تینوں نظمیں اسی مجموعہ کا حصہ تھیں لیکن چونکہ اس مجموعہ کے چھپنے میں دیر ہوئی اور وہ الگ الگ کتابی شکل میں شائع ہوگئیں اس لیے میں نے انھیں الگ ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

میں جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں تقریباً ڈیڑھ سال بعد جیل سے رہا ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ "پتھر کی دیوار" دو چار مہینے میں کتابی شکل اختیار کرے گی۔ لیکن گذشتہ تین سال میں یہ کتاب مختلف ناشروں کے پاس چکر لگاتی رہی۔ اسکی کتابت کئی بار ہوئی اور ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے طباعت رُک گئی۔ آخر اب تین سال کی دیر سے یہ مجموعہ چھپ رہا ہے جس کیلئے میں مکتبہ شاہراہ اور اس کے مالک محمد یوسف صاحب کا شکر گذار ہوں جن کی حوصلہ مندی کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کی تازگی اور اہمیت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک جبر و تشدد کا موجودہ نظام زندہ ہے اور عوام کے دلوں میں اس کو تبدیل کر دینے کی ہمت اور ایک نئے، بہتر اور خوبصورت نظام کو قائم کرنے کی اُمنگ باقی ہے۔ اس کے بعد میری نظموں کا کیا حشر ہوگا مجھے اس کی بالکل فکر نہیں ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ میری شاعری وقتی ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم کر لینے میں ذرا سی بھی جھجک نہیں ہے ہر شاعری وقتی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہی سمجھتا ہوں اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سرے ہو جائیں گے آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔

ہر شاعر اپنے فن کے دامن میں روحِ عصر کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے کوئی کم اور کوئی زیادہ لیکن کسی نہ کسی حد تک ہر شاعر روحِ عصر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اپنی اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔ آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہو رہی ہے۔ کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔ اس اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے نغموں میں کل کچھ دیرپا قدریں پائی جائیں گی۔ دیرپا قدروں کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے جنھیں کبھی کبھی ادب اور فن کی زبان میں "ابدی قدریں" بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ اس تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آکر عدم میں کھو جاتی ہے ابدی چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے میں شاعری میں آج

کی حقیقت یا روحِ عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔

آج کی حقیقت کیا ہے؟ یہ روحِ عصر کیسی ہے؟

آج پرانا نظام اور سماج مر رہا ہے اور نیا نظام اور سماج پیدا ہو رہا ہے۔ انسان اپنی پانچ چھ ہزار برس کی طویل تہذیبی تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو وہم اور طبقات کی زنجیروں سے آزاد کر رہا ہے۔ پہلی بار انسان کے سر سے انسان کے پیدا کئے ہوئے ظلم و استبداد کا سایہ اُٹھ رہا ہے اور پہلی بار اس "خالص" انسان کا ظہور ہو رہا ہے جو آقا نہیں ہے، غلام نہیں ہے، جاگیردار نہیں ہے، سرمایہ دار نہیں ہے۔ ظالم نہیں ہے مظلوم نہیں ہے۔ بلکہ صرف انسان ہے۔ آج پہلی بار اس محنت کش کا ظہور ہو رہا ہے جو جسمانی اور ذہنی محنت کے خانوں میں تقسیم نہیں ہے۔ اور جو اپنی محنت کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ آج پہلی بار وہ انسان زمین پر قدم رکھ رہا ہے جو فطرت سے خوفزدہ نہیں ہے اور جو قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا رہا ہے۔ آج پہلی بار وہ انسان پیدا ہوا ہے جو رنگ اور نسل کے امتیازات اور جغرافیائی حدود میں اسیر نہیں ہے۔ اس انسان کے خواب صدیوں نے ضرور دیکھے تھے، لیکن یہ انسان آج سے پہلے وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لئے حقیقتاً یہ میلادِ آدم کی گھڑی ہے۔ یہ جشنِ آدم کا وقت ہے۔ جو جد و جہد اس مبارک مقصد کے لئے ہو رہی ہے وہ بڑی خوفناک لیکن بڑی عظیم الشان ہے۔ ابھی کچھ ایسی قوتیں موجود ہیں جو انسان کی خلقت میں حائل ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی توپوں، بندوقوں اور طیاروں سے اس دنیا ہی کو تباہ کر دینا چاہتی ہیں جس کے گہوارے میں انسان پرورش پا رہا ہے۔ ان شیطانی قوتوں کے مقابلے پر جو قوتیں اُٹھ رہی ہیں ان کے ہاتھوں میں سنگیت اور شاعری، علم حکمت اور ہنر کے ناقابلِ شکست حربے ہیں۔ اس جد و جہد کی ترجمانی کرنے، میلادِ آدم کی بشارت دینے اور جشنِ آدم کی قصیدہ خوانی کرنے کا فخر آج کے شاعر کو حاصل ہوا ہے۔ اور مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اس صدی کا شاعر ہوں جو ہزاروں برس پُرانے خوابوں کی تعبیر کی صدی ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہ دُنیا بن رہی ہے سنور رہی ہے۔ میری نظروں کے سامنے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ کروڑوں ہاتھ جن کے بازوؤں میں تعمیر کی قوت ہے ایک ساتھ لہرا رہے ہیں۔ کروڑوں آوازیں جن میں تخلیق کا نغمہ ہے ایک ساتھ گا رہی ہیں۔ کروڑوں تخیل جن میں زندگی کا حوصلہ ہے وقت اور تاریخ پر اپنی کمند پھینک رہے ہیں۔ اور ان میں میرا بھی ایک چھوٹا سا ہاتھ ہے، میری بھی ایک ہلکی سی آواز، میرا بھی ایک ذرا سا تخیل شامل ہے۔ یہ دلفریب نظارہ اس صدی سے پہلے کے شاعروں کو کہاں نصیب ہوا تھا۔

اس عہد کے سامنے فکری مدرسے، تمام احساسات اور جذبات اس ایک حقیقت سے وابستہ ہیں۔ آج کی روحِ عصر اس حقیقت اور اس سے وابستہ فکری مدرسوں اور احساسات اور جذبات سے بنی ہے اور میری ساری کوشش یہی ہے کہ میں اس روحِ عصر کو سمیٹ سکوں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ لیکن میری کوشش جاری ہے۔ اور یہ مجموعہ اس کوشش کا نتیجہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں اپنی شاعری کو "نالۂ نیم شبی" اور "آہِ سحر گاہی" نہیں بنا سکا ہوں میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں اور میرے سامنے اقبال کا پیش کیا ہوا یہ آدرش ہے ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفان

بعض لوگوں کو یہ دنیا تاریک اور گندی نظر آتی ہے۔ واقعی یہاں بڑی تاریکی اور گندگی ہے۔ بڑا ظلم ہے، بڑا افلاس ہے، بڑی سنگدلی ہے اور اس لئے وہ اسی کو سب سے بڑی حقیقت سمجھ کر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہندستان ہی کو لیجئے۔ اس میں تین چار کروڑ بے روزگار ہیں، دس پندرہ کروڑ اپاہج اور بیمار ہیں۔ بیس پچیس کروڑ بھوکے اور ننگے ہیں۔ کئی کروڑ عیاش اور انسانیت سوز حرکتیں کرنے والے کمینے ہیں۔ میں نے یہ ساری گندگی دیکھی ہے۔ میں نے ایسے باپ بھی دیکھے ہیں جو اپنی بیٹی کو بیچ دینے کی فکر میں ہیں۔ ایسے بیٹے بھی دیکھے ہیں جو بوڑھی ماں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے بچے بھی دیکھے ہیں جنھوں نے بولنا سیکھنے سے پہلے ماں بہن کی دلالی کا کام شروع کر دیا ہے۔ ایسے غنڈے بھی دیکھے ہیں جنھوں نے کئی قتل کئے ہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی میں اسے زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ حاوی حقیقت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میں نے اس گندگی اور غلاظت، سفاکی اور سنگدلی کے خلاف جد و جہد کرنے والے مجاہدوں کو بھی دیکھا ہے میں نے بہادری کے وہ نظارے بھی دیکھے ہیں جہاں نہتے آدمی گولیوں کی بوچھار دوں میں بھی آگے ہی بڑھتے ہیں۔ وہ قربانیاں بھی دیکھی ہیں کہ ذاتی حسرتوں اور آسائشوں کو وسیع انسانیت کے مفاد کے لئے ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو سماج کی صدیوں پرانی غلاظت اور درندگی کو دور کر کے زندگی اور انسان کو پاک و پاکیزہ بنا رہی ہیں۔ پہلی مرتی ہوئی حقیقت ہے۔ اور دوسری زندہ اور ابھرتی ہوئی حقیقت، اس لئے پہلی حقیقت اپنی انتہائی خباثت کے باوجود

بھی مجھے پست ہمت، مایوس اور قنوطی نہیں بنا سکتی ہے۔

میں اپنے نالہ و بکا، آہ و فریاد سے اس غموں سے بھری ہوئی دنیا کو اور زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔ سماج کی انحطاطی طاقتیں تو یہ چاہتی ہیں کہ اس زہر آلود فضا کو اور زیادہ زہر آلود کیا جائے۔ لیکن ترقی پسند طاقتوں کا تقاضا یہ ہے کہ فضا کو زہر سے صاف کر کے پاکیزہ کر دیا جائے۔ اور بقول پبلو نرودا ہمیں اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اس ہوا میں زہر گھول دیں جس میں ہم ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی سانس لیں گی۔ اس لئے میں تاریکی، افلاس درندگی اور غلاظت کو ماضی کی حقیقت سمجھتا ہوں جو برابر اپنی قبر کے اندر گھستی چلی جا رہی ہے اس کے خلاف جو جد و جہد ہے وہ حال کی حقیقت ہے۔ اور اس جد و جہد سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں جس انسان کی تخلیق ہو رہی ہے وہ حقیقت ہے جو حال کو مستقبل بنا دیتی ہے۔ آج یہ شاندار جد و جہد دنیا کے ہر ملک میں ہو رہی ہے۔ اور اس نے ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے — ہندوستان، ایران، افریقہ، انگلستان، امریکہ وغیرہ میں جد و جہد کے دوران میں نئے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ چین اور سوویت یونین وغیرہ میں یہ تخلیق تکمیل کی منزلوں کے قریب پہنچ رہی ہے۔ جب ہم روحِ عصر کو اس طرح سمجھتے ہیں تو وہ ہمارے دلوں میں نشاط اور حوصلہ مندی پیدا کرتی ہے۔ مایوسی اور قنوطیت نہیں۔ پھر منہ سے یہ جملہ نہیں نکل سکتا کہ جب یہ دنیا بدل جائے گی تب میں رونا چھوڑ دوں گا۔ تب منہ سے صرف یہ نکلے گا کہ ہم اپنی فریاد میں للکار کی تاثیر پیدا کریں گے اپنے آنسوؤں کو شراروں میں بدل دیں گے۔ اپنے زخموں سے زبانیں پیدا کریں گے۔ شیطنت کے سامنے رونا، گڑگڑانا، پسپا ہونا انسانیت کی توہین ہے اور ہماری انسانیت ہمارے سینوں میں زندہ ہے۔ اس یقین سے وہ فن پیدا ہوگا جس پر پیٹ بھری حسین لڑکیاں آہیں نہیں بھریں گی۔ بلکہ جسے کارزارِ زندگی میں آگے بڑھنے والے انسان اپنا ہتھیار سمجھ کر اٹھا لیں گے یہی میری شاعری کا مقصد ہے۔ جس میں کامیاب ہونے کی میں ابھی کوشش کر رہا ہوں۔ اور اس کوشش میں اپنے پڑھنے اور سننے والوں کا تعاون چاہتا ہوں۔ جو مجھے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ ملتا رہا ہے۔ مجھے کبھی اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی ان کو مجھ سے یہ شکایت ضرور پیدا ہوئی ہے اور بجا طور پر پیدا ہوئی ہے کہ میں نے زندگی اور حقیقت کی ترجمانی میں کوتاہی کی ہے۔ اس لئے مجھے اپنی جد و جہد میں اور زیادہ خلوص اور زیادہ محنت سے کام لینا چاہیئے۔ اپنی زندگی کے تجربے کو اور زیادہ وسیع نقطۂ نگاہ کو اور زیادہ واضح کرنا

چاہیئے اور ان نظریات سے اور زیادہ بچنا چاہیئے۔ جو جبت پرستی کی کمیں گاہوں سے دن رات ہم پر یلغار کرتے رہتے ہیں اور اکثر غیر شعوری طور سے ہمارے فن میں سرایت کر جاتے ہیں۔

میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری کرتا رہا ہوں۔ میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لئے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔ اس کوشش میں میں ان حدوں کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور "شاعرانہ" زبان کے بیچ میں حائل ہیں۔ جہاں میں ان حدوں کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں "شاعرانہ" زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں۔ یہ دراصل بول چال کی زبان کا عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بول چال کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے۔ لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر "شاعرانہ" زبان بنائی جاتی ہے تو وہ مصنوعی ہوتی ہے۔

پرانی تشبیہ اور استعارے، پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے۔ کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کی نئی حقیقیں نئے طریقِ اظہار اور انداز بیان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس لئے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہ اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں۔ اور نئی امیجری بھی۔ میں نے اس اصول کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں اس لئے آپ کو میرے یہاں ایسے مصرعے ملیں گے جیسے ؎

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر

یا

پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہُو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں

یا

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلالوں نے

نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

یا

چاندنوں کی صورت پر مفلسی پرستی ہے

میں صرف زنداں اور قفس کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں بلکہ بعض اوقات میں جیل اور قید خانہ کے لفظ کو ترجیح دیتا ہوں۔ صرف پہرہ دار اور پاسبان ہی نہیں بلکہ وارڈر اور نمبردار کے الفاظ کو بھی جائز سمجھتا ہوں کیونکہ یہ عام استعمال کے الفاظ ہیں اور جیل میں یہی الفاظ سنائی دیتے ہیں۔

اس اصول میں ایک خوبی تو یہ ہے کہ انداز بیان میں تنوع کے بڑے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور دوسری یہ کہ جدید زندگی، اس کی شیطنت اور آدمیت دونوں اپنے سارے لوازمات کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو حقیقت نگاری کے لئے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں گل، بلبل، شمع، پروانہ، دریا، ساحل، کشتی، رہبر، رہزن، منزل، جادہ، مینا، ساغر، تیغ تفنگ ہی نہیں ملتے بلکہ روٹی، چاول، دھان، گیہوں، نمک، ریل، مشین، مزدور، رائفل، ٹینک بمبار، چولھا، پتیلی اور اسی قسم کے دوسرے عام الفاظ کی بھی بہتات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض حضرات کو یہ الفاظ غیر شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ الفاظ بجائے خود شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں ہوتے۔ یہ تو شاعر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ لفظوں کو کیسے استعمال کرتا ہے اس لئے میں ہر لفظ کو استعمال کرنے پر آمادہ رہتا ہوں۔ اپنی اس کوشش میں مجھے بعض اوقات ناکامی بھی ہوئی ہے۔ اور مصرعے بھونڈے اور بھدّے ہو گئے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں میں کامیاب ہو گیا ہوں مجھے اپنی ناکامی کا صلہ مل گیا ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اگر اسے محض روایتی تشبیہوں اور استعاروں میں کہوں تو یہ محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص جامہ وار کی پتلون اور چکن کا کوٹ پہنے چلا آرہا ہے جس سے کافور کی گولیوں کی بو آرہی ہے۔ اسے میں جامہ وار اور چکن کا غلط استعمال سمجھتا ہوں۔ دوسری طرف میں ململ کا انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہن کر بھی میدانِ کارزار میں اترنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اس مجموعے میں، میرے دوسرے مجموعوں کی طرح، پابند شاعری بھی ملے گی اور آزاد شاعری بھی کیونکہ شاعری ہمیشہ ردیف اور قافیہ کی محتاج نہیں رہتی۔ ترکی کے شاعرِ اعظم ناظم حکمت کے الفاظ میں جس طرح ردیف اور قافیہ پر اصرار کرنا ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے، اسی طرح محض آزاد شاعری پر اصرار کرنا بھی ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے۔ اصل کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ موضوع کو بہتر سے بہتر ہیئت کا لباس عطا کیا جائے اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ کوئی ایک مخصوص ہیئت

ہی سب سے زیادہ حسین ہے۔ اس لئے میں پابند اور آزاد دونوں قسم کی شاعری کا قائل ہوں۔

لیکن دونوں کے طریقوں میں ذرا سا فرق ہے۔ پابند نظم میں زیادہ تر مصرعوں اور شعروں کی تعمیر پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن میں اس کے برعکس آزاد نظم میں بندوں کی تعمیر کو انفرادی مصرعوں کی تعمیر سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں چونکہ آزاد نظم میں ردیف اور قافیوں کی جھنکار نہیں ہوتی اس لئے اس میں داخلی ترنم کا جادو بہت ضروری ہے۔ یہ ترنم خارجی بھی ہوتا ہے اور داخلی بھی، اس لئے انتخاب الفاظ کے علاوہ مصرعوں کے باہمی ربط سے بھی پیدا ہوتا ہے جو اپنی جگہ معنوی تسلسل کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے ہر بند کو ایک مکمل تصویر ہونا چاہیئے۔ تاکہ مکمل نظم ایک بہت بڑی تصویر کی طرح ہو جسے تمام چھوٹی چھوٹی تصویریں مل کر بناتی ہوں۔ (اس کے بغیر آزاد نظم کے مصرعے الگ الگ ایک دوسرے کی طرف سے منھ پھیرتے ہوئے ٹکڑے نظر آئیں گے) مثال کے لئے یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

یہ مجاہد، یہ بہادر، یہ جیالے، یہ کسان
برق و باراں کے حریف
جن کے چہروں پہ ہے دھرتی کا سکون اور وقار
اور ہتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیاریاں بوتے تھے اشکوں کی، لہو کاٹتے تھے
آج ہر دشت میں، ہر کھیت میں، ہر میداں میں
سُرخ سینوں سے چھڑکتے ہیں لہو کی بوندیں
بجلیاں ہیلتی ہیں، گل کھلتے ہیں، بم اُگتے ہیں

(تلنگانہ)

یہ تو باغی کسانوں کی تصویر تھی۔ اب رات کا سراپا دیکھئے ؎

نیلگوں جوان سینہ
نیلگوں جوان باہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے

وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں کے دانتوں سے
کھِل کھِلا کے ہنستے ہیں

(نیند)

آزاد نظم کے بندوں کی یہ تعمیر پابند نظم کے مصرعوں کی تعمیر سے بہت مختلف ہے جس کی مثال اس بند میں ملے گی ؎

وہ لائیں اپنے سیہ ارادے، ہم اپنے دل کی اُمنگ لائیں
ہم اپنے لوح و قلم نکالیں، وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں
ہم اپنے بربط کے تار چھیڑیں، وہ شورشِ رعد جنگ لائیں
ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں، وہ خونِ ناحق کا رنگ لائیں
لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب، جو لہو کا بیوپار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

(یلغار)

پابند نظم میں ہر ہر مصرعے پر الگ الگ داد دی جا سکتی ہے۔ آزاد نظم میں یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں خیال یا تصویر کی تکمیل پورے بند کی تکمیل کے ساتھ ہوتی ہے۔

چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور سے گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں اس لئے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔ میں اکثر مشاعروں میں اپنی آزاد نظمیں پڑھتا ہوں۔ اور مجھے اس تجربے میں کامیابی ہوئی ہے۔ مجھ سے پہلے مخدوم بھی اپنی نظم "اندھیرا" اور "استالن کی آواز" کے ذریعے سے یہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارے ملک اور زبان میں آزاد شاعری کو قبول عام کی سند

نہیں مل سکتی۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ آزاد نظم ردیف اور قافیہ ہی سے نہیں بلکہ بحر اور ترنم سے بھی عاری ہوتی ہے۔ یوں تو نثر میں بھی شاعری کی جا سکتی ہے اور بعض لوگ کرتے ہیں لیکن اردو کے زیادہ تر شعرار آزاد نظم میں بحروں کے مقررہ ارکان کی تعداد تبدیل کر کے انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح بحروں کی وہ مانوس شکل تو باقی نہیں رہتی جو اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن بحر باقی رہتی ہے، اور ترنم بھی۔ بعض نظموں میں بحروں کی مانوس شکل بھی باقی رہتی ہے۔ صرف ردیف اور قافیے نہیں ہوتے جیسے پتھر کی دیوار یا نیند۔ کبھی کبھی ان نظموں کے کسی بند میں خود بخود قافیے بھی آجاتے ہیں۔ جو خیال کی روانی میں حائل نہیں ہوتے۔ اور اس لئے ناگوار نہیں گذرتے۔ مثلاً ؎

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عامِ جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بیکسی و مجبوری
مفلسی و ناداری

(پتھر کی دیوار)

یا

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہدیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے

چند سکّوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اُٹھے اور چمن بیچ دیا

(فریب)

اس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس قسم کی شاعری کو پرانی کسوٹیوں پر نہیں کسا جا سکتا۔ پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ "ہمیں حُسن کا معیار تبدیل کرنا ہے" اور واقعہ یہ ہے کہ حُسن کا معیار بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے، اور بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے اور اس لئے ہماری ترقی پسند شاعری میں جمالیات کا ایک نیا تصوّر کارفرما ہے۔ ہمارا رومانیت کا تصوّر بھی بدل رہا ہے۔ میری طرح کی شاعری کرنیوالے زندگی کی تلخیوں سے بھاگ کر محبوب کی باہنوں یا فطرت میں پناہ نہیں لیتے۔ اور نہ اپنے زمانے سے پشیمان ہو کر بیتے ہوئے زمانے میں روپوش ہوتے ہیں۔ بلکہ زندگی کو بدل دینے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ جذبی کے الفاظ میں "عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ خالص مادی نقطۂ نظر نہ ہونے کی وجہ سے داخلیت کہیں نہ کہیں سے راہ پا جاتی ہے۔ یہ لغزش بسا اوقات غیر مارکسی ادیب کا رُخ اخلاق اور روحانیت کے قدیم سہاروں کی طرف پھیر دیتی ہے اور جہاں یہ سہارے بھی نہیں ہوتے وہاں شاہد و شراب کی رنگینیاں سہارا بن جاتی ہیں۔ اکی طریقۂ فکر ہمیں اس قسم کے سہارے نہیں دیتا جو انسانی تاریخ میں کبھی بھی بیکس انسانوں کے کام نہ آ سکے۔ اس کے بجائے وہ ہمارے سامنے خالص مادّی بنیادوں پر حقیقت ہی کو سامنے نہیں لاتا بلکہ ایک ایسے تابندہ مستقبل کا خواب بھی دکھلاتا ہے جو دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے میں حقیقت بن چکا ہے۔"

(فروزاں کا دیباچہ)

میرا خیال ہے کہ ہم آج کی حقیقت میں مستقبل کے انہیں ٹھوس خوابوں کی آمیزش سے رومان حُسن اور وفور پیدا کر سکتے ہیں اس لئے میں نے صرف پھولوں اور ستاروں، محبوب کے رخساروں اور آنکھوں، چھلکتے ہوئے جاموں اور لرزتے ہوئے پیراہنوں ہی میں حُسن نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ تیل کے چشموں اور کوئلے کی کانوں اور سوت کے کارخانوں میں بھی حُسن بکھرا ہوا پایا ہے۔ اس تصوّر ہی سے اس طرح کی تصویریں بنتی ہیں۔ جیسے "سیاہ ہیرا" (کوئلہ)

"پگھلے ہوئے ستارے" (چمنیوں کا تیل) "کپاس کی چاندنی" (روئی) یا "سورج کی رنگین کرنوں کی تھکتی ہوئی انگلیاں" (رات کے تار) وغیرہ وغیرہ۔ یہ نئی تصویریں ہیں جنھیں میں نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے اور اس طرح کے مصرعے کہے ہیں۔ ع

ہے چمنیوں کا دھواں بھی پُرپیچ کاکلوں کی طرح دل آرا

لیکن چونکہ ہمارے موجودہ سماج میں انسان مشین پر نہیں بلکہ مشین انسان پر حاوی ہے اور ظلم اور استحصال کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اس لئے ایسی تصویریں بھی ملیں گی۔ ع

چمنیاں بھتنیوں کی طرح بال کھولے ہوئے

مگر یہی بھتنیاں ہمارے قبضے میں آنے کے بعد شہزادیاں بن جائیں گی اور پھر ہم "ناچتی چرخیوں" اور "گنگناتی ہوئی تکلیوں" اور "کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکتے ہوئے دل" کے گیت گائیں گے۔

میرے لئے زمین سے زیادہ حسین، انسان سے زیادہ پُروقار اور مستقبل سے زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے۔ ادب اور آرٹ کی سب سے بڑی جمالیاتی قدریں انہیں سے پیدا ہوتی ہیں۔

بمبئی

۱۷ مئی ۱۹۵۳ء

سردار جعفری

پتّھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی
آدمی بھی محنت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
رُوح و دِل کی تنہائی
اک طویل سنّاٹا
جیسے سانپ لہرائے

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزر جائے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سُبک لمحے
مُنجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریخیں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر

دُھوپ پر سُکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مُسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دُودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی دیواریں

بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دِن نگلتے ہیں

ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں

آنسوؤں کی زنجیریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہرے پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کُھردرے لبوں پر صرف

بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں تمنّائیں
آرزوئیں اُمیدیں
خواب اور تعبیریں
اشک پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں

دُھوپ کی سُنہری زُلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سُولیوں پہ چڑھتی ہیں

اور اس اندھیرے میں
سُولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے سے
سُرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں
بارگوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں

خامشی کی نبضوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفان ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں

نقشِ پا بغاوت کے

جتنا ظُلم سہتے ہیں
اور مُسکراتے ہیں
جتنا دُکھ اُٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں

جبر اور بڑھتا ہے
زہر اور چڑھتا ہے
ظالموں کی شدّت پر
ظلم چیخ اُٹھتا ہے

ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دِل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
"انقلاب زندہ باد"

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے

انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کی گودوں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اُٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عام جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرق آتش و آہن
بے بسی و مجبوری
مفلسی و ناداری

تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آجائے

○

موت

"وارڈر

موت سے جا کے کہہ دو کہ اس وقت فرصت نہیں
پھر کبھی آئے

جیلر کو درخواست دے

کم سے کم پندرہ روز پہلے
تاکہ سی آئی ڈی والے تحقیق کر لیں کہ یہ کون ہے
کس لئے آئی ہے"

موت "کچھ اپنی بیوی بہن دوست یا ماں نہیں
اس پہ سی آئی ڈی والوں نے
کوئی پابندی اب تک لگائی نہیں
وہ تو جب چاہے آئے، ملے اور چلی جائے

جس کو چاہے اُسے ساتھ لے جائے
اس کو ہر طرح کے اختیارات ہیں
اور یہ موت تو خود بڑے حاکموں ہی کے احکام سے آئی ہے
اور کسی میں اسے روک دینے کی جرأت نہیں
آپ پھاٹک پہ آجائیے
ورنہ وہ خود ہی پارک میں آجائے گی"

اور اک دم سے پھاٹک کھُلا
سائرن بج اُٹھا
اونچے ٹاور پہ خطرے کے جھنڈے نے انگڑائی لی
موت داخل ہوئی
میں نے دیکھا
اور ہم سب نے دیکھا
موت کے بیسیوں سر تھے اور سیکڑوں ہاتھ تھے
لاٹھیوں کی طرح
رائفل کی طرح
انگلیاں لمبی لمبی تھیں، ناخن سنگینوں کے
جسم خاکی تھا،
چہرہ گلابی تھا،

بارُود کی سانس تھی

پاؤں چمڑے کے جوتوں میں
لوہے کی کیلوں سے
پتھر کی راہوں پہ بجتے ہوئے

لفٹ رائٹ کی آواز دیتے ہوئے
جیسے اک دَورِ ماقبل تاریخ کا اژدہا
بُھولے بسرے ہوئے جنگلوں سے نکل آیا ہو
لوگ یہ کہتے ہیں موت کی شکل و صورت نہیں
وہ مگر آج ہم سب کی نظروں کے آگے کھڑی تھی
ہیٹ پہنے ہوئے
اپنی موٹی کمر اور چمڑے کی پیٹی میں پستول باندھے ہوئے

ظُلم کے راج کی جے کہو
جس میں ہر شخص کے واسطے موت ہے
قیدیوں کے لئے
درزیوں کے لئے
موچیوں کے لئے
دفتروں کے کلرکوں، رفیوجی مُصیبت زدوں کے لئے
عورتوں اور بچوں کی معصُومیت کے لئے

موت ہے موت ہے موت ہے

زندگی بار ہے

بھوک تکلیف دہ

مفلسی اور بے روزگاری کا طاعون پھیلا ہوا

روٹیوں کی جگہ موت لو

دھوتیوں ساریوں کی جگہ موت لو

گھر نہیں موت کی گود میں سو رہو

کام ملتا نہیں اور ملیں بند ہوتی چلی جا رہی ہیں

فکر کی بات کوئی نہیں

اپنے جن راج کے منتظم منتری

رات دن اپنی جنتا کی سیوا میں مصروف ہیں

موت کے کارخانے بنانے میں مشغول ہیں

موت کے کارخانے میں چھٹی نہیں

صرف بھرتی ہی بھرتی ہے بھرتے چلے جاؤ

اپنی بیوی کو بھی بھیج دو

اپنے بچوں کو بھی ساتھ لو

اور بونس میں اک قبر یا اک چتا

جو بھی چاہو گے مل جائے گی

ملک میں اب پولس راج ہرگز نہیں

وہ تو انگریز کے وقت تھا
آج کل موت کا راج ہے
موت جو سب کی ہمدرد ہے
سب کی غم خوار ہے
آج ہم قیدیوں سے ملاقات کے واسطے آئی تھی
ہم وطن سے بہت دُور ہیں
اپنے احباب کی دوستی
اور عزیزوں کی الفت سے محروم ہیں
کوئی ملنے کو آتا نہیں
مائیں بیمار ہیں
باپ بوڑھے ہیں اور بیویاں دُور ہیں
بچّے کم عمر ہیں
موت کے بادشاہوں کی غمخواریاں —
ناز برداریاں —
موت ملنے کو تشریف لے آئی ہے

ہم مگر سر پھرے، من چلے اور مغرور ہیں
موت سے ہم کو ملنے کی فرصت نہیں

○

مقتُول ممتا

(اُن عورتوں کے نام جو ۲۷ر اپریل سنہ ۱۹۴۹ء کو کلکتہ میں شہید ہوئیں)

میں تم کو اپنی بہن کہوں یا رفیق سمجھوں
مگر وطن کی زمین ماں کہہ کے یاد کرتی رہے گی تم کو
کہ تم نے خاک وطن کو اپنا لہو دیا ہے
تمھارے چہروں کا نُور بنگال کی جبیں پر دمک رہا ہے

تم اپنے پیاروں کی بھُوک سے بیقرار ہو کر
گھروں سے باہر نکل پڑی تھیں
تم اپنے شہر اپنے دیس اپنے وطن کی سڑکوں پہ چل رہی تھیں
تم اپنے آکاش کی فضاؤں میں گا رہی تھیں
تم اپنے اہلِ وطن کو انصاف اور صداقت کا نام لے کر
وطن کی خاطر بلا رہی تھیں

تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھی
نہ آنچلوں میں بموں کے گولے
لبوں پہ نعرے گلوں میں آنسو دلوں میں عزم شکستِ زنداں
جوان شانوں پہ سُرخ پرچم مچل رہے تھے
پولیس کی لاریوں سے لیکن
تمہارے سینوں پہ آگ کے تیر چل رہے تھے
تمہارے ماتھوں پہ گرم سیسہ برس رہا تھا

وہ کوکھ زخمی ہے جس میں بچّوں کی مُسکراہٹ چھپی ہوئی تھی
وہ سینے چھلنی ہیں گولیوں سے
جو نسلِ آدم کے آئینے تھے
وہ جسم اب رکھ ہو چکے ہیں
کہ جن کے اندر
نہ جانے کتنے سڈول جسموں کا رقصِ پنہاں جھلک رہا تھا
تمہارے بے سُدھ جوان ہاتھوں کو پالنے ڈھونڈھتے رہیں گے

ہزار لعنت اس آدمی پر
جو پھلتے پیڑوں کو کاٹ ڈالے
ہزار پھٹکار اس سیاست کی بزدلی پر

جو عورتوں کو بھی مار ڈالے
زمانہ اس ظلم اس اہنسا پہ حشر تک تھوکتا رہے گا

مگر میں یہ جانتا ہوں میری شہید بہنو
تمہارا خون رائیگاں نہ ہوگا
یہ خون کے قطرے
یہ سُرخ تارے
جو قلبِ بنگال میں فروزاں ہیں پرچموں پر جوان ہوں گے
اُنہیں کی گرمی سے انتقام اپنی آگ پیدا کرے گا اک دن
اُنہیں کی سُرخی سے پھول اپنی بہاریں لیں گے
اُنہیں کی بیتابیوں اُنہیں کی تڑپ سے وہ سورما اُٹھیں گے
جو ظلم کے راج کو جہنّم کی پستیوں میں ڈھکیل دیں گے
وہ سب تمہارے سپوت ہوں گے
اور اُن کی نسلوں کے بانکپن میں
تمہاری مقتول ماما جاوداں رہے گی

○

بمبئی

سبز و شاداب ساحل
ریت کے اور پانی کے گیت
مُسکراتے سمندر کا سیّال چہرہ
چاند سورج کے ٹکڑے
لاکھوں آئینے موجوں میں بکھرے ہوئے
کشتیاں بادبانوں کے آنچل میں اپنے سروں کو چھپائے ہوئے
جال نیلے سمندر میں ڈوبے ہوئے
خاک پر سُوکھتی مچھلیاں
گھاٹنیں --- پتھروں کی وہ ترشی ہوئی مورتیں
ایلیفنٹا کے غاروں سے جو رقص کرتی نکل آئی ہیں

راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے

شاہیں نیلی ہوا کی نمی میں نہائی ہوئی
صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے
خواب آلود کہسار کے سلسلے
جنگلوں کے گھنے سائے
مٹی کی خوشبو
مہکتی ہوئی کونپلیں

پتھروں کی چٹانیں
اپنی بانہوں میں بحرِ عرب کو سمیٹے ہوئے

وہ چٹانوں پہ رکھے ہوئے اونچے اونچے محل
چکنی دیواروں پر
قتل، غارتگری، بزدلی، نفع خوری کی پرچھائیاں
ریشمی ساریاں
مخملیں جسم، زہریلے ناخونوں کی بلیاں
خون کی پیاس کھادی کے پیراہنوں میں

جگمگاتے ہوئے قمقمے، پارک، باغات اور میوزیم
سنگِ مرمر کے بت، دھات کے آدمی
سرد و سنگین عظمت کے پیکر

آنکھیں بے نُور، لب بے صدا، ہاتھ بے جان
ہند کی بے بسی اور محکومی کی یادگاریں
سیکڑوں سال کے گرم آتش کدے
زرد صندل کی آگ
عود و عنبر کے شعلے

"چالیس" افلاس کی گرد، تاریکیاں
گندگی اور عفونت
گھوڑے سڑتے ہوئے
رہگذاروں پہ سوتے ہوئے آدمی
ٹاٹ پڑا ور کاغذ کے ٹکڑوں پہ پھیلے ہوئے جسم، سوکھے ہوئے ہاتھ
زخم کی آستینوں سے نکلی ہوئی ہڈیاں
کوڑھیوں کے ہجوم
"کھولیاں" جیسے اندھے کنوئیں
گرم سینوں، محبت کی گودوں سے محروم بچے
بکریوں کی طرح رسیوں سے بندھے
ان کی مائیں ابھی کارخانوں سے واپس نہیں آئی ہیں

چمنیاں بھتنیوں کی طرح بال کھولے ہوئے

کارخانے گرجتے ہوئے
خُون کی اور پسینے کی بُو میں شرابور
خُون سرمایہ داری کے نالوں میں بہتا ہوا
بھٹیوں میں اُبلتا ہوا
سرد سکّوں کی صورت میں جمتا ہوا
سونے چاندی میں تبدیل ہوتا ہوا
بنک کی کھڑکیوں میں چراغاں
سڑکیں دن رات چلتی ہوئی
سانس لیتی ہوئی
آدمی خواہشوں کے اندھیرے نشیبوں میں سیلاب کی طرح بہتے ہوئے
چور بازار، سٹّہ، جواری
ریس کے گھوڑے، سرکار کے منتری
سنیما، لڑکیاں، ایکٹر، مسخرے
ایک اک چیز بکتی ہوئی
گاجریں، مولیاں، ککڑیاں
جسم اور ذہن اور شاعری
علم، حکمت، سیاست
انکھڑیوں اور ہونٹوں کے نیلام گھر
عارضوں کی دکانیں

بازوؤں اور سینوں کے بازار
پنڈلیوں اور رانوں کے گودام
دیش بھگتی کے دلاّل کھادی کے بیوپاری
عقل، انصاف، پاکیزگی، اور صداقت کے تاجر
کانگرس کے مداری

یہ ہے ہندوستاں کی عروس البلاد
سرزمینِ دکن کی دُلہن بمبئی
ایک جنّت جہنم کی آغوش میں
یا اسے یوں کہوں
ایک دوزخ ہے فردوس کی گود میں

یہ مرا شہر ہے
گو مرا جسم اس خاکداں سے نہیں
میری مٹّی یہاں سے بہت دُور گنگا کے پانی سے گوندھی گئی ہے
میرے دل میں ہمالہ کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
پھر بھی اے بمبئی تو مرا شہر ہے
تیرے باغات میں میری یادوں کے کتنے ہی رم خوردہ آہو
میں نے تیرے پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کھائی ہے

تیری شفاف جھیلوں کا پانی پیا ہے
تیرے ساحل کی ہنستی ہوئی سیپیاں مجھ کو پہچانتی ہیں
ناریل کے درختوں کی لمبی قطاریں
تیرے نیلے سمندر کے طوفان اور قہقہے
تیرے دلکش مضافات کے سبزہ زاروں کی خاموشیاں
رنگینیں، نکہتیں، سب مجھے جانتی ہیں
اس جگہ میرے خوابوں کو آنکھیں ملیں
اور میری محبت کے بوسوں نے اپنے حسیں ہونٹ حاصل کیے

قومی پارٹی، میری ماں کا وطن
لال جھنڈے کی وہ پہلی انگڑائی ہے
جس نے ہندوستاں کو جگایا
تجھ کو لینن نے آواز دی
ماسکو نے پکارا
تاجکستان اور ازبکستان کے شاعروں نے ترے گیت گائے
مرحبا بمبئی!
مرحبا سُرخ پرچم
آنسوؤں اور آنکھوں نے پلکوں کی چلمن ہٹا کر
تیری بھرپور انگڑائی دیکھی

لاکھوں سر اُٹھ گئے
مُٹھیاں بندھ گئیں
گردنیں تن گئیں
سینے باہر نکل آئے
ہندوستاں اک نئے دَور میں آگیا

بمبئی

تیرے سینے میں سرمایہ کا زہر بھی
انقلاب اور بغاوت کا تریاق بھی
تیرے پہلو میں فولاد کا قلب ہے
تیری نبضوں میں مزدور و ملاح کا خون ہے
تیری آغوش میں کارخانوں کی دُنیا بسی ہے
سیوری، لال باغ اور پریل
اور یہاں تیرے بیٹے تری بیٹیاں
ان کی دُکھتی ہوئی انگلیاں
سوت کے ایک اک تار سے
ملک کے قاتلوں کا کفن بُن رہی ہیں

○

دکن کی شہزادی

بمبئی اے دکن کی شہزادی
نیلگوں سُندری اجنتا کی
اپنی اُونچی چٹان سے نیچے
اپنے بالوں کو دھونے آئی ہے
پنڈلیاں مچھلیاں ہیں چاندی کی
پاؤں ڈوبے ہوئے سمندر میں
انگلیاں کھیلتی ہیں پانی سے
جلتے ہیروں کی لاکھوں آنکھوں سے
پگھلے نیلم کے نیلے ہونٹوں سے
میرے خوابوں میں مُسکراتی ہے
دل کے طوفان خیز ساحل پر
موجیں گاتی ہیں رقص کرتی ہیں
جھاگ کے آنچلوں کو لہراتی
چاندنی کی انگوٹھیاں پہنے

بھیگے تاروں کے پھول برساتی

تیری قوسِ قزح کی گردن میں
موجِ بحرِ عرب کی باہیں ہیں
تیرے ماتھے کو پیار کرتی ہیں
ترچھی پرچھائیاں جہازوں کی
خوں کی گردش میں ہے مشین کا راگ
ناچتی انگلیوں میں سوت کے تار
جسم پر سیپیوں کی نرم چمک
اور نظروں میں موتیوں کا غرور
میں ہمالہ کے دیس کا باسی
تو سمندر کی گود کی پالی!
کیا کہوں کیسے یاد آتی ہے
ذہن کے ملگجی اُجالے میں
تیری تصویر جھلملاتی ہے
چاندنی رات میں گلاب کا پھول

تو پٹیل اور مُرار۔جی کی نہیں
میرے خوابوں کی شاہزادی ہے

تو نہیں مارواڑیوں کی کنیز
جو ترا حُسن بیچ کھاتے ہیں
آہ یہ نفع خور یہ دلال
مغربی منڈیوں کے چکلوں میں
تجھ کو نیلام پر چڑھاتے ہیں
اور میں غصے سے کانپ جاتا ہوں
میں ترے حُسن کا محافظ ہوں
میرے دل، میرے ذہن میں دن رات
آندھیاں برف کے لبادوں میں
بجلیوں کے قدم سے چلتی ہیں
سُرخ شہپر بغاوتوں کے عقاب
فکر کے آسماں پہ اُڑتے ہیں
کالے بنیوں کے چور ہاتھوں سے
میں تجھے آن کر چھڑا لوں گا
اے سمندر کے حُسن کی بیٹی
میں تجھے گود میں اُٹھا لوں گا
اپنے شاعر کی دلنواز سے تو

○

اودھ کی خاکِ حسیں

گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اُڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سُن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصوّر کے زخم خوردہ
اُفق سے یادوں کے کارواں یوں گذر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گذریں

میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر

کہاں ہیں وہ دلنواز باہیں
وہ شاخِ صندل
کہ جس پر انگڑائیوں نے اپنے حسین نشیمن بنا لیے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
میری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو پکارتے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت[1] پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لیکر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں

---

[1] "میگھ دوت" بہ معنی بادل۔ اس نام کی مشہور نظم کالیداس نے لکھی تھی جس میں بادل محبت کا پیامی ہے۔

قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

مرے تصور میں ساقیوں کا خرامِ رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں
نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
وہ گاؤں جو سیکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پہ ٹنگے ہوئے ہیں ۔
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پہ
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو ادودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھاؤں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو

ہزاروں برسوں سے جگمگادوں

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
وہ کھیتوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نور بن کر اتر رہے ہیں
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اُگے ہوئے ہیں
کدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں
زمین کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے

بلکتی آنتوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمیں کے سینے پہ قاتلوں کے گروہ کب تک چلا کریں گے
خباثتیں کب تک اہنسا کا روپ دھارے پھرا کریں گی

کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جھکے ہیں
وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں
جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں
یہ جسم جو کارخانے داروں کی بھٹیوں میں ابل رہے ہیں
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں
یہ خون جو نفع خوریوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
یہ ننھے بچے جو گاؤں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں
جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اگا رہے ہیں
یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے
یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
یہ زخم کب تک ہرے رہیں گے

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سُرخ شعلے اُبل رہے ہیں
غموں کی بھاری سِلیں دلوں سے سرک رہی ہیں
شجاعتیں گو پھنوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جھکے ہوئے سر اُبھرتے سورج کی شان و شوکت سے اُٹھ رہے ہیں
یہ سُورماؤں کی سرزمیں ہے
یہ آسمانِ خموش طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے
یہ مسکراتی ہوئی فضا سُرخ آندھیوں سے بھری ہوئی ہے
یہاں کا ایک ایک چپہ لاکھوں بغاوتوں سے بسا ہوا ہے
بغاوتیں جو مغل شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں
بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں
بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پہ ہیبت بٹھا چکی ہیں
یہی پُرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو
میں ان پُرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجماں ہوں
میں اپنے اہلِ وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپالے
لُٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں

میں لاکھوں مزدور نوجوانوں کے ساتھ میداں میں آ رہا ہوں
غدر کے مقتول سورماؤں کو مرقدوں سے اٹھا رہا ہوں
میں چوری چورا کے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں
چمن کے پھولو چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخو فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا مُکھی اچھالو
ریلوں کے پہیّو بغاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہو اے نیکیوں کی فوجو
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتوں آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز و تند موجو فنا کے خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنو اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّو
جو سیکڑوں میل دُور سے اُڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
مرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا
اسے بتانا
کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں

وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آ گیا ہے
جسے اہنسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے
مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کوئی دبا سکا ہے؟
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دُور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

○

نیا ودھان

اُنھیں نہ ہر اک حق
ہر ایک ادھیکار
اور ہمیں کوئی حق نہیں ہے
اُنھیں یہ حق ہے کہ بنجروں سے خراج لیں
پتھروں کی رگ رگ سے خون نچوڑیں
بہار کو لُوٹ لیں
چمن کو اجاڑ دیں
دن کو رات کر دیں
ہمارے گیتوں کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا دیں
مہکتے پھولوں کو توڑ لیں
اپنی نفع خوری کی پیاس
ماؤں کے دودھ کو بیچ کر بجھائیں

اُنھیں یہ حق ہے
لبوں پہ مُہریں
زباں پہ تالے لگائیں
محنت کے ہاتھ کاٹیں
اُنھیں یہ حق ہے کہ کارخانوں کو جیل خانہ بنا کے رکھ دیں
کسان کی کھیتیوں کو نیلام پر چڑھا دیں
زمیں سے انسانیت کا سارا رواج اُٹھا دیں
وہ رات کے وقت آکے نیند اور میٹھے خوابوں کو قید کر لیں
وہ بھوک کو جُرم، پیاس کو اک گناہ کہہ دیں
ہر ایک انساں پہ سانس لینا حرام کر دیں
اگر وہ چاہیں تو جیب کتروں کو راج پر سُکھ کا تاج بخشیں
اگر وہ چاہیں تو قاتلوں کو تمام بھارت کا راج بخشیں
ہماری کنیاؤں کا تبسم، ہماری بہنوں کی سادگی کو
شکاگو نیو یارک اور لندن کی رنڈیوں پر نثار کر دیں
اُنھیں یہ حق ہے
گھروں کو ویران کر دیں
ماؤں کی آنکھ کا نور چھین لیں
اور سہاگنوں کا سہاگ لے لیں
لہو سے اپنے گھروں کی دیوار پوت لیں

اور ہوس پرستی کی جیب بھریں

اگر زباں بھی ملے
تو گُدّی سے کھینچ لیں

دار پر چڑھا دیں

یہ اُن کا حق ہے جو حکمراں ہیں
ہمارا حق بھوک، بے بسی، مفلسی، جہالت
خود اپنے سینے کی آگ
اپنے لہو کا ملبوس
اپنے زخموں کی باغبانی
یہی ہے جمہوریت تو ایسی ذلیل جمہوریت پہ لعنت
ہم آج بیدار ہو چکے ہیں
ہمارے غم ہمتوں کو مہمیز کر رہے ہیں
ہمارے دُکھ آج ہم کو جہد و عمل کے میداں میں لا رہے ہیں
شہید اپنے لہو کے جلتے اُفق سے آواز دے رہے ہیں
بُلا رہے ہیں
مچلتے جھنڈوں کی سُرخ انگڑائیوں میں ہے سرکشی کی دعوت
دہکتی سڑکیں ہمارے قدموں میں اپنی آنکھیں بچھا رہی ہیں
اُبلتے دریا گرج رہے ہیں

گرجتے طوفان اُبل رہے ہیں
وسیع جنگل، بلند پربت
ہماری بیباکیوں کو دل میں چھپا رہے ہیں
گھنیرے پیڑوں کی آڑ سے
جھاڑیوں کے سینے سے
حملہ آور نکل رہے ہیں
ملوں سے ہڑتالیں، کھیتیوں سے بغاوتیں سر اٹھا رہی ہیں
گھروں سے،
اسکولوں کالجوں اور اسپتالوں سے
ایسی ہمت اُبل رہی ہے
کہ عہدِ ماضی کے سورماؤں کو رشک آئے
ہم آج ہر مورچے پہ یلغار کر رہے ہیں
ہر ایک چپے پہ قوم کی حاکمیت کی مہریں لگا رہے ہیں
ہر ایک ذرّے پہ اپنا جھنڈا جما رہے ہیں۔

ہم اپنی جمہوریت کا دستور
کارخانوں میں
کھیتوں میں بنا رہے ہیں
ہماری دستور ساز مجلس

گلی میں کوچوں میں بٹتی ہے
ہمارے پیر تی دنعتی وہ دہقان جو بغاوت کی سرزمیں پر
حسین اصولوں،
جوان نعروں کی سرخ فصلیں اُگا رہے ہیں
ہمارے مندوب وہ مجاہد
جو رائفل اور گولیوں کے سیاہ طوفاں میں گا رہے ہیں
جو اپنی آہوں اور آنسوؤں کے جلوس لے کر نکل پڑے ہیں
جو پھانسیوں کے اُفق سے انسانیت کی منزل دکھا رہے ہیں

لکھو ہمارا وِدھان امن اور شانتی کا وِدھان ہوگا
لکھو ہمارے وطن کے پرچم کا رنگ، رنگِ بہار ہوگا
لکھو کہ مزدور اور کسانوں کے سر پہ عظمت کا تاج ہوگا
لکھو مشینوں پہ اور زمینوں پہ صرف محنت کا راج ہوگا
لکھو کہ پانی کی آنکھ اشکوں سے تر نہ ہوگی
لکھو کہ انساں کے خوں میں بھیگی سحر نہ ہوگی۔
لکھو کہ بیوپاریوں کو سفاک قاتلوں کی سزا ملے گی
لکھو کہ جنگیں حرام ہوں گی
لکھو کہ جنگوں سے آنے والا سیہ منافع حرام ہوگا
حرام ہوگی حرام خوری

لکھو کہ تن کو لباس
سینوں کو علم
ہاتھوں کو کام ہوگا
لکھو کہ روٹی کا اور انساں کی بھوک کا احترام ہوگا
لکھو کہ ہونٹوں کو مسکرانے کا
اور ٹہنیوں کو جگمگانے کا حق ملے گا
لکھو کہ ماتھوں کو حسنِ رنگِ شفق ملے گا
لکھو محبّت کے دل کو پاکیزگی
نگاہوں کو نور
بانہوں کو رقص کی سرخوشی ملے گی۔
ہر اک کو تعلیم اور آسودگی ملے گی
لکھو کہ ہندوستان چین اور روس سے ہمکنار ہوگا
لکھو کہ ہم ہوں گے اور وطن ہوگا اور جشنِ بہار ہوگا

سنٹرل جیل ناسک
جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

○

کب تلک

کب تلک زندگی کے چہرے پر — موت کے ناگ زہر اُڑائیں گے
کب تلک درد کی فضاؤں میں — تیر ٹیسوں کے سنسنائیں گے
خون روئے گا کب تلک انصاف — کب تلک ظلم مسکرائیں گے
کب تلک اپنے کھیت میں دہقان — فصل کی ارتھیاں اٹھائیں گے
کب تلک آرزو کے سینے میں — آرزو کی چتا جلائیں گے
کب تلک محنتوں کے قلب و جگر — کارخانے میں پیسے جائیں گے
کب تلک بھوک چلائیں — کب تلک پیاس پیاس گائیں گے
کب تلک دل کی شاخِ حسرت پر — رنج و غم آشیاں بنائیں گے
کب تلک عورتوں کا بچوں کا — موت والے لہو بہائیں گے
کب تلک خاکِ پاک کے بیٹے — سولیوں پہ چڑھائے جائیں گے

آنسوؤں کا اُفق ہے ابر آلود
خون کا آسماں گرجتا ہے

ساتھیو، شعر، گیت، تقریریں
کھول دو بجلیوں کی زنجیریں
دیدو اب زلزلوں کو اذنِ خرام
وقت ہے انقلاب لے آؤ
پھونک دو ظلم کے اندھیرے کو
عدل کا آفتاب لے آؤ

○

میرے خواب

اے مرے حسیں خوابو
تم کہاں سے آئے ہو
کس اُفق سے اُبھرے ہو
کس شفق سے نِکھرے ہو
کن گلوں کی صحبت میں
تم نے تربیت پائی
کس جہاں سے لائے ہو
یہ جمال و رعنائی

جیل تو بھیانک ہے
اس ذلیل دُنیا میں
حسن کا گذر کیسا
رنگ ہے نہ نکہت ہے

نور ہے نہ جلوہ ہے
جبر کی حکومت ہے
تم کہاں سے آئے ہو
اے مرے حسین خوابو

میں نے تم کو دیکھا ہے
یاد اب، نہیں آتا
شاید ایک لڑکی کی
تھرتھراتی پلکوں میں
جگمگاتی آنکھوں میں
یا کسی تبسم میں
جو نہا کے نکلا ہو
آنسوؤں کی شبنم سے

اک ہمکتے بچے کی
مٹھیوں کے پھولوں پر
تتلیوں کی یورش سی
اور ماں کی نظروں میں
سینکڑوں امیدوں کے

شوخ رنگ گلدستے

میں نے تم کو دیکھا ہے
ننھی ننھی گڑیوں میں
ناچتے کھلونوں میں
یا ربر کی گیندوں میں
میں نے تم کو دیکھا ہے
گھٹنیوں چلے ہو تم
توتلی زبانوں سے
تم نے دودھ مانگا ہے

"ایک شاہزادہ تھا"
"ایک شاہزادی تھی"
اس حسیں کہانی پر
جانے کتنے بچوں نے
اپنے سر اٹھائے ہیں
جانے کتنی آنکھوں میں
پھول مسکرائے ہیں
اور میں سمجھتا ہوں

تم اسی کہانی کی
سرزمیں سے آئے ہو

کچھ کسان کنیائیں
سبز و سُرخ شیشوں کی
چوڑیاں کلائی میں
اور گلٹ کی چاندی کی
ہنسلیوں سے گردن میں
نیم چاند کے حلقے
چولیوں پہ لہنگوں پر
زرد زرد مٹی کے
زرد بیل بوٹے سے
میلے میلے آنچل پر
بالیوں کے بوسے ہیں
ان کے ہاتھ میں ہنسئے
گیت گانے لگتے ہیں
جھُوم جھُوم کر پودے
اپنا سر جھکاتے ہیں
نوجوان لٹھیارے

کھیت کی منڈیروں پر
پریم گیت گاتے ہیں
اے مرے حسیں خوابو
تم انہیں بہاروں کی
کونپلوں سے پھوٹے ہیں

ایک کارخانے میں
چند نوجوانوں نے
انجمن بنائی ہے
اور اس میں لینن کی
اک کتاب پڑھتے ہیں
سُن رہی ہیں دیواریں
ہنس رہی ہے تاریکی
نوجوان بیٹھے ہیں،
اور کتاب پڑھتے ہیں
ایک ایک جُملے پر
چونک چونک پڑتے ہیں
ایک ایک فقرے پر
اپنا سر ہلاتے ہیں

گاہ آہ بھرتے ہیں
گاہ مسکراتے ہیں
میں نے ماں کے سینوں میں
اے مرے حسیں خوابو
تم کو ناچتے دیکھا
میں نے تم کو دیکھا ہے
جب سیاہ محرابیں
آسماں پہ بنتی ہیں
جب سکوت کی پریاں
کہکشاں پہ چلتی ہیں
گیسوؤں کی نکہت سے
جب ہوا مہکتی ہے
جب فضا چہکتی ہے
میرے گرم ہونٹوں پر
پیار تھرتھراتے ہیں
اور میری محبوبہ
اپنے رنگِ عارض سے
بجلیاں بناتی ہے
اور میری نظروں میں

اک جہان لٹتا ہے
اک جہان بنتا ہے
اک زمین ہٹتی ہے
اک زمین آتی ہے

میں اسیر ہوں لیکن
تم کو کوئی بھی قانون
قید کر نہیں سکتا
سربلند اور آزاد
یُوں ہی مُسکرائے جاؤ
میرے دل کی دُنیا میں
یُوں ہی جگمگائے جاؤ
قید و بند کے جلّاد
تم کو پا نہیں سکتے
لمبے لمبے ظالم ہاتھ
تم کو چھُو نہیں سکتے
اے مرے حسین خوابو

○

شادی کا دن

سفید بادل
لرزتے آنچل
بلند و بالا حسین نیلا ہٹوں کے سر سے ڈھلک گئے تھے
فضا کے چہرے پہ مست ہو کر
ہزاروں کرنیں بکھر گئی تھیں
ہرے بھرے پیڑ،
روشنی،
روشنی کے جھولے

ہوا کی پینگیں
شریر بچوں کی طرح سے پتیوں کی معصوم کھلکھلاہٹ
زمین کو نرم گھاس کی ننھی انگلیاں گدگدا رہی تھیں
یہ دن بہت ہی حسین دن تھا
جسے تمہارے حسین اقرارِ عشق نے اور خوبصورت بنا دیا تھا

یہ دن اس طرح سج کے پھر آج آگیا ہے
سفید ہاتھوں سے کوٹھری کی سیہ سلاخوں کو چھو رہا ہے
وہی تبسم، وہی تمہارا سا شوخ اندازِ دلربائی
مگر نگاہوں میں وہ پرانی چمک نہیں ہے
کہ اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے
سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں

سنٹرل جیل، ناسک
۳۰ جنوری ۱۹۵۰ء

جیل کی رات

پہاڑ سی رات
اداس تارے، تھکے مسافر
گھنا اندھیرا، سیاہ جنگل
جہاں سلاخیں اُگی ہوئی ہیں
اذیتوں کے پُرانے عفریت قیدیوں کو نگل رہے ہیں
خموشی سہمی ہوئی کھڑی ہے
سیاہی اپنے سیاہ دانتوں سے روشنی کو چبا رہی ہے
اُچاٹ نیندوں کے ناگ آنکھوں کو ڈس رہے ہیں
میں چھد رہا ہوں ہزار کانٹوں سے اپنی بے چین کروٹوں میں
یہ رات بھی کل کی رات کی طرح اپنی سفاکیوں کو لے کر
اُفق کے اس پار جا چھپے گی
مگر مجھے ڈس نہیں سکے گی
مری نگاہوں میں میری محبوب تیری صورت رچی ہوئی ہے
یہ چاند میری حسین یادوں کے آسماں پر کھلا ہوا ہے
ترے تصور سے میرے سینے میں چاندنی ہے

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

تمہاری آنکھیں

تمہاری آنکھیں
حسین، شفاف، مسکراتی، جوان آنکھیں
لرزتی پلکوں کی چلمنوں میں
شہابی چہرے پہ ابرؤوں کی کماں کے نیچے
تمہاری آنکھیں
وہ جن کی نظروں کے ٹھنڈے سائے میں میری الفت
مری جوانی کی رات پروان چڑھ رہی تھی
تمہاری آنکھیں
اندھیری راتوں میں جو ستاروں کی روشنی سے
فضائے زنداں میں جھانکتی ہیں

میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں

میں پڑھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں
تمہاری آنکھیں تمہاری پلکیں کہانیاں سی سُنا رہی ہیں
میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
مسرتوں کے گلاب ہر سمت کھل رہے ہیں
تمہاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں

مجھے گرفتار کر کے جب جیل لا رہے تھے پولیس والے
تم اپنے بستر سے اپنے دل کے
ادھورے خوابوں کو لے کے بیدار ہو گئی تھیں
تمہاری پلکوں سے نیند اب بھی ٹپک رہی تھی
مگر نگاہوں میں نفرتوں کے عظیم شعلے بھڑک اُٹھے تھے
تمہاری آنکھیں حقارتوں کے جہنموں کو جگا رہی تھیں
نظامِ ظلم و ستم پہ بجلی گرا رہی تھیں

مری محبت نے اپنی جنت کا حُسن دیکھا
تمہاری آنکھوں پہ میری نظروں کے پیار برسے
مری امیدوں، مری تمناؤں نے صدا دی

یہ نفرتوں کی عظیم مشعل جلائے رکھنا
کہ یہ محبت کے دل کا شعلہ ہے جس کی رنگین روشنی میں
ہمارے خوابوں کے راستے جگمگا رہے ہیں

تمہاری آنکھیں

جو میرے سینے میں تیرتی ہیں
کنول کی کلیاں جو میرے دل میں کھلی ہوئی ہیں
انہیں سے دو اور آنکھیں بیدار ہو گئی ہیں
وہ ننھے ننھے چمکتے ہیروں کی ننھی کنیاں
جو میری آنکھوں کا نور لے کر تمہارے آنچل سے جھانکتے ہیں
پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں
یہ سلسلہ تا ابد رہے گا
زمانے کی گود میں ستاروں کے حُسن کی ندیاں بہیں گی
وہ سب تمہاری
وہ سب ہماری ہی آنکھیں ہوں گی
ہماری آنکھیں کہ جن سے شعلے برس رہے ہیں
مگر وہ کل کا حسین دن دیکھو کتنا نزدیک آگیا ہے
ہماری آنکھوں سے جب بہاریں چھلک پڑیں گی

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

تجدیدِ وفا

پھول تھے سُرخ بہاریں تھیں جواں
وہ مہکتی ہوئی باتیں وہ مہکتے ہوئے ہونٹ
وہ تبسّم کہ شفق شرمائے
قہقہے، راگنی جس طرح فضا میں لہرائے
جسم پاکیزہ و شاداب و جوان
چاندنی جیسے مجسّم ہو جائے

ایسے ہی حُسن سے یونان کے فنکاروں نے
اپنی وینس کے تصور کو تراشا ہوگا
ایسے ہی حُسن کے چہرے سے تصوّرے کر
عہدِ پارینہ کے نقاشوں نے
اپنے خوابوں کے اجنتا کو سنوارا ہوگا

وہ سمندر کا کنارہ وہ چمکتی ہوئی ریت

موجیں، پگھلے ہوئے نیلم کی طلسمی پریاں
رقص کرتی ہوئی آتی تھیں ترے قدموں میں
اور پھر ریت میں کھو جاتی تھیں
ڈوبتی شام کے سورج کی سنہری کرنیں
تیرے کاکل، ترے رخسار پہ سو جاتی تھیں
اور ہوائیں ترے آنچل کو ترے شانوں کو
شوق سے چوم کے دیوانی سی ہو جاتی تھیں
اور میں اپنے رقیبوں پہ ہنسا کرتا تھا
"والٹ وہٹ مین" کے نغموں میں سمندر کا اُبال
"مایا کاوسکی" — جس طرح ہواؤں کا خروش
اور ہم اپنی جوانی کی اُمنگیں لے کر
وقت کے چیختے چنگھاڑتے طوفانوں میں
عشق کی ناؤ کو کھینے کے لئے نکلے تھے

اپنی وارفتگیٔ شوق کا عالم ہے وہی
دلِ بیتاب وہی دیدۂ پُرنم ہے وہی

سنٹرل جیل ناسک
جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

نیند

(اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

دن کی خشمگیں نظریں
کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور
بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی
تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری
گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی
خامشی کی فریادیں
تہہ نشیں اندھیرے میں
شب کی شوخ دوشیزہ

خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے آنچل میں
جنگلوں کی خوشبوئیں
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں باہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے

موتیوں کے دانتوں سے
کھکھلا کے ہنستے ہیں
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جُھولے میں
آسمان پر تارے
ننھے ننھے ہاتھوں سے
بُن رہے ہیں جادو سا
جھینگروں کی آوازیں
کہہ رہی ہیں افسانہ
دور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سُناتی ہے
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

روز رات کو یُونہی

نیند میری آنکھوں سے
بیوفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچّے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
نرم نرم گالوں کو
گرم گرم آنکھوں کو
جھک کے پیار کرتی ہے
اک حسین پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے

سنٹرل جیل ناسک
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

ایک سال

قید کیا چیز ہے، زنداں کی حقیقت کیا ہے؟
قبر کی گود میں سوئے ہوئے سال
تیری سمٹی ہوئی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیں پر
جیل کے بھونکتے کتوں کی صدا روتی ہے
میں حقارت سے نظر ڈال کے ہنس دیتا ہوں

زہر آلود وہ بیتے ہوئے لمحات کے ڈنک
خوں میں ڈوبی ہوئی وہ صبح کی تلوار کی دھار
شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر
اور ہفتوں کے سپاہی وہ مہینوں کے سوار
جو مرے جوشِ بغاوت کو کچلنے کے لئے
فوج در فوج کیا کرتے تھے یلغار اپنی
میں انھیں بھی ترے پہلو میں سلا آیا ہوں

پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں
اور قانون وہ سرمائے کی زنجیر گراں
حلقے حلقے میں لیئے اپنی اہنسا کا فریب
اپنے دامن کو بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے
کینچلی سانپ کی ہر سال بدل جاتی ہے
عدل و انصاف مداری کے پٹارے جن میں
ناگ بیٹھے ہیں قوانین کے پھن پھیلائے
اور آئین کا بین
اپنی لہروں میں چھپا لیتا ہے
تلخیٔ زہر میں ڈوبی ہوئی پھنکاروں کو

پھر بھی قربانی و ایثار کا دل زندہ ہے
جہد و پیکار کی نبضوں کی دھمک جاری ہے
وقت و تاریخ کی راہوں سے گذرتے ہیں جلوس

(۲)

جن میں کتنی جواں سال اُمنگوں کا لہو
ہو گیا صرف نئی صبح کے غازے کے لئے

اور یونان کی آزاد حسیناؤں نے
کتنے دل فصلِ بہاراں کے لیے بوئے ہیں
چشمِ اسپین سے راتوں کے برستے آنسو
مضطرب گوہر و شبنم میں بدلنے کے لیے
ویت نام اور ملایا کے شہیدوں کا لہو
شفقِ سرخ کے جلتے ہوئے آئینے میں
ایک تصویرِ حسیں بن کے جھلک آیا ہے
خاک پر آ کے اگا ئے ہیں وہ شعلے جن میں
مسکرانے کے لیے ہیں بیتاب
چاند سورج کے کنول، فصلِ بہاراں کے گلاب
اور تلنگانے کی نظروں سے برستی ہوئی آگ
دوڑتی ہے خس و خاشاکِ غلامی کے لیے
روحِ بنگال کے زخموں کو ملی ہیں آنکھیں
درد و فریاد نے نعروں کی زباں پائی ہے
گوشے گوشے سے ابلتے ہوئے سیلاب کا جوش
ذرے ذرے سے نکلتے ہوئے انوار کا رقص
موت کا کرب، غلامی کا بھیانک چہرہ
جاگتے اور ابھرتے ہوئے انساں کا جلال
قید کیا چیز ہے زنداں کی حقیقت کیا ہے؟

(۳)

روز و شب کیا ہیں ؟

فقط سنگِ نشاں راہوں کے

ماہ اور سال بجز گردِ سفر کچھ بھی نہیں

جیل ہر گام پہ آتی ہے گذر جاتی ہے

وادیاں رلتی ہیں غفلت کی، مصیبت کے پہاڑ

بھوک اور پیاس کے صحراؤں میں دل جلتے ہیں

خون کے کھولتے دریا میں اُبلتی ہے حیات

گرم سنگینوں کے پُرخار بیابانوں میں

نقشِ پا سُرخ لکیروں میں بدل جاتے ہیں

کارواں منزلِ مقصود کی جانب ہے رواں

نظریں پلکوں سے اُٹھاتی ہیں مناظر کے نقاب

خواب جاگ اُٹھتے ہیں چہروں کے گلستاں لے کر

(۴)

مجھ کو تنہائی کا احساس نہیں ہے کہ یہاں

کتنی نوخیز اُمنگیں ہیں مرے ساتھ اسیر

کتنے کہسار کی آغوش کے پالے ہوئے لال

کتنے کھیتوں کے سپوت

کتنے ریلوں کے مشینوں کے چلانے والے

کتنے بوسوں کی مہک، کتنی ہی زلفوں کی شکن
کتنی بہنوں کی امیدوں کے کنول
کتنی ماؤں کی مرادوں کے چراغ
کتنے دریاؤں کے طوفان، ہوا کے جھونکے
کتنی ہڑتالوں کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ
کتنے احساسِ بغاوت کے اُبھرتے پرچم

جتنے اونچے ہیں مصیبت کے پہاڑ
ہمتیں اتنی ہی بیباک و سرافراز و بلند
حوصلے ہیں کہ ہمالہ کے عقابوں کی اُڑان
جن کے شہپر کی ہوا برف کی آندھی بن کر
آسمانوں کی بلندی سے گذر جاتی ہے

اور وہ بوڑھے وہ جہاں دیدہ رفیق
جھریاں جن کی ہیں تاریخ حوادث کے ورق
ہنستی آنکھوں کی چمک، نرم تبسم کی شکن
طنز ہے جابرِ حکومت کی ستم کاری پر
ان کے بالوں کی سفیدی یہ خبر دیتی ہے
کہ شب تارِ غلامی کی سحر دور نہیں

اور وہ شعلہ نفس شاعر و افسانہ نگار
اپنے نغموں کی حرارت سے گگا دیتے ہیں
روح کے بوجھ کو، افکار کی زنجیروں کو
ان کا ہر شعر رجز پڑھتا ہے
ہر سطر کہتی ہے جرأت کی کہانی ہم سے
ان کے ہر گیت سے دل ہلتا ہے دیواروں کا
جیسے بڑھتی ہوئی فوجوں کی دھمک
شعلے آواز کے اس شان سے ہوتے ہیں بلند
آگ لگ جاتی ہے زنداں کے سیہ خانے میں
اور منزل کی جبیں وقت کی محرابوں میں
جگمگا اُٹھتی ہے رنگین شعاعوں کی طرح
میرے احساس و تصوّر کو ہزاروں سورج
لاکھوں چاند اور کروڑوں تارے
رنگ اور نور کی بارش میں بھگو دیتے ہیں

ہم سفر یہ ہیں تو پھر عزمِ سفر کیا کہنا
رنگِ شب یہ ہو تو پھر رنگِ سحر کیا کہنا

سنٹرل جیل ناسک
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

زنداں بہ زنداں

(ترکی کے شاعرِ اعظم ناظم حکمت کے نام)

ناظم، اے شاعرِ آتش گفتار
تو نہیں جیل میں فردوسی و حافظ ہیں اسیر
پا بہ زنجیر ہیں ترکی کے عوامی نغمے
بیڑیاں پہنے ہوئے بیٹھی ہے زنداں میں بہار

قاتل آزاد ہیں، جلاد و جرائم آزاد
ظلم آزاد، مظالم کے طریقے آزاد
موت آزاد، ڈکیتی آزاد
نفع بازوں کی ہوس، خون کے بنکوں کی پیاس
اہلِ جاگیر کی، سرمائے کے عفریت کی بھوک
سانپ کے دانت، قوانین کے ڈنک
سب ہی آزاد ہیں جنگل کے درندوں کی طرح

صرف اک شاعر و انسان نہیں ہے آزاد
اس لئے ترکی میں انسان کی آزادی کے
گیت گانے کی سزا ملتی ہے
دس برس، بیس برس، تیس برس زندان میں

میرے بھائی مرے مشرق کی بہاروں کے سفیر
غم کی گھنگھور گھٹاؤں میں چمکتے ہوئے چاند
صبح ترکی کے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرن
میں نے دس سال ہوئے تیری سُنی تھی آواز
جو نکل آئی تھی مُنھ توڑ کے زندانوں کے
آج پھر تیری صدا
حلقۂ طوق و سلاسل سے نکل آئی ہے
نرم، جس طرح سے شبنم میں نہائے ہوئے پھول
گرم، ماؤں کی محبّت کی طرح
تیز، پھوڑوں میں اُترتے ہوئے نشتر کی طرح
تیری آواز گرجتے ہوئے طوفاں کا جلال
تیری آواز کڑکتی ہوئی بجلی کی چمک
سر بلند اور سبک از غمِ عقاب
گیہوں اور دھان کے کھیتوں کی طرح سے بھرپور

ہلکی، اڑتی ہوئی چڑیوں کے پروں کے مانند
بھاری، توپوں کی طرح
حشر انگیز، لڑائی کے جہازوں کی طرح
پھر بھی پُرامن وحسین وشاداب

آج پھر تیری صدا آئی ہے دس سال کے بعد
انقرہ اور سمرنا کے سیہ خانوں سے
اور میں سوچ رہا ہوں —— اب بھی
سالہا سال کی تاریکی وتنہائی کے بعد
تیری للکار کی سطوت ہے وہی
تیری آواز میں سونے کی کھنک باقی ہے
"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

تیری آواز ہے ترکی کے کسانوں کی تڑپ
تیری آواز ہے مزدوروں کے زخموں کی زبان
تیری آواز ہے ڈالر کے غلاموں کی شکست

"مردِ بیمار" پہ یہ رات بہت ہے بھاری

پھونک دے گرمیٔ گفتار سے محفل ساری

ترکی و ہند میں اے دوست کوئی فرق نہیں
چاہے وہ ہند کے قاتل ہوں کہ ترکی کے ڈکیت
سازشیں کرتے ہیں ہر طرح کے قصابوں سے
ماؤں کو بیچ کے، بہنوں کو چڑھا کر نیلام
شعر و نغمہ کا گلا گھونٹ رہے ہیں جلاد
پھانسیاں اُگتی ہیں اس دیس میں پیڑوں کی جگہ
جیلیں بنتی ہیں گھروں کے بدلے
اور دھرتی کی نسوں میں جیسے
درد اور ٹیس کا، چیخوں کا لہو بہتا ہے

ہم کو لڑنا ہے اسی ظلم و تشدد کے خلاف
اور اس جنگ میں اے شاعر آتش گفتار
آگے بڑھتی ہوئی مزدوروں کی ہڑتالوں میں
کھیت بوتے ہوئے دہقانوں کی پیکاروں میں
تیرے جذبات، ترے گیت، تری آگ بھی ہے

ہم کو معلوم ہے تو جیل میں ہے بند مگر

تیرا دل ہند میں ہے، چین میں، یونان میں ہے
اور میں تیرے پرستاروں کی جانب سے تجھے
دے رہا ہوں یہ محبت کا پیام
ہم ترے واسطے میداں میں اُتر آئے ہیں
ہند کی جنگ ہے تری کی مسرّت کے لئے
آج اس ملک کے مزدور یہاں کے دہقان
رہبر و شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
جیل میں تیری رہائی کے لئے بیٹھے ہیں
جلوۂ شامِ اودھ، صبح بنارس زخمی
سڑکیں کلکتے کی بچوں کے لہو سے رنگین
تیرے گیتوں کی حفاظت کے لئے

اور وہ دن دور نہیں ہے شاید
دور افتادہ رفیق
ہم جب آزاد فضاؤں میں بلائیں گے تجھے
اپنی محفل میں تجھے دیکھیں گے
تیرے ہونٹوں کے تبسّم سے چنیں گے نغمے
تیرے نغمات کی بارش میں نہا جائیں گے

سنٹرل جیل ناسک
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

خُونیں ہاتھ

یہ وہی ہاتھ ہیں سفاک و دراز
ہاں وہی ہاتھ ستم پیشہ و چالاک و ذلیل
میرے پہچانے ہوئے اور ترے پہچانے ہوئے
وہ جو مغرب کے سیہ پوش اُفق سے نکلے
آگ مشرق کی بہاروں میں لگانے کے لئے
آج بھی میرے حسیں دیس میں بل کھاتے ہیں
آستینوں میں چھپا لیتے ہیں بم ایٹم کے
خوشے گیہوں کے ہتھیلی پہ سجا لاتے ہیں

ہاں وہی ہاتھ کڑکتے ہوئے کوڑوں کی طرح
زخم ہر پیٹھ پہ ہر جسم پہ برساتے ہوئے
یا کسی ٹوٹ کے گرتی ہوئی بجلی کی طرح
باغ پر کھیتوں پہ کھلیانوں پہ لہراتے ہوئے
ظلم کی طرح نڈر، رات کی مانند طویل
کوڑھ کی طرح سفید

خشمگیں جیسے جہنّم میں دہکتی ہوئی آگ
گرم تلوار کے مانند کلیجوں پہ رواں
ماؤں کے دودھ بھرے سینوں پہ بیٹھے ہوئے ناگ

کیسے بھولوں کہ وہی ہاتھ وہی سانپ ہیں یہ
ڈس چکے ہیں جو محبت کو تمناؤں کو
جن کی پھنکاروں نے بِس گھول دیا پانی میں
جن کی پرچھائیں نے جھلسا دیا صحراؤں کو

ہاں وہی ہاتھ وہی خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھ
قتل و غارت کے ارادوں نے جنا ہے جن کو
اسلحہ ساز مشینوں کے تراشے ہوئے ہاتھ
موت کا روپ منافع نے دیا ہے جن کو

آہ ان ہاتھوں سے میں ہاتھ ملاؤں کیونکر
اپنی نفرت کو حقارت کو چھپاؤں کیونکر

توڑ دو کاٹ دو یا آگ لگا دو ان کو
بن پڑے جیسے بھی گردن سے ہٹا دو ان کو

بھوکی ماں بھوکا بچّہ

میرے ننھے، مرے معصوم، مرے نورِ نظر
آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو
اپنی آغوشِ محبت میں سُلا لے تجھ کو

تیرے ہونٹوں کا یہ جادو تھا کہ سینے سے مرے
ندّیاں دودھ کی بہہ نکلی تھیں
چھاتیاں آج مری سُوکھ گئی ہیں لیکن
آنکھیں سُوکھی نہیں اب تک مرے لال
درد کا چشمۂ بیتاب رواں ہے ان سے
میرے اشکوں ہی سے تو پیاس بجھا لے اپنی

سنتی ہوں کھیتوں میں اب ناج نہیں اُگ سکتا
کانگرس راج میں سونا ہی پھلا کرتا ہے
گائے کے تھن سے نکلتی ہے چمکتی چاندی
اور تجوری کی درازوں میں سمٹ جاتی ہے

چاند سے دودھ نہیں بہتا ہے
تارے چاول ہیں نہ گیہوں نہ جوار
ورنہ میں تیرے لئے چاند ستارے لاتی
مرے ننھے مرے معصوم مرے نورِ نظر
آکہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو
اپنی آغوشِ محبت میں سلا لے تجھ کو

سو بھی جا میری محبت کی کلی
میری جوانی کے گلاب
میرے افلاس کے ہیرے سو جا
نیند میں آئیں گی ہنستی ہوئی پریاں ترے پاس
بوتلیں دودھ کی شربت کے کٹورے لے کر

جانے آواز کی لوری تھی کہ پریوں کا طلسم

نیند سی آنے لگی بچے کو
کھنچ گئی نیلگوں ہونٹوں پہ خموشی کی لکیر
مٹھیاں کھول دیں اور موند لیں آنکھیں اپنی
یوں ڈھلکنے لگا منکا جیسے
شام کے غار میں سورج گر جائے

جھک گئی ماں کی جبیں بیٹے کی پیشانی پر
اب نہ آنسو تھے، نہ سسکی تھی نہ لوری نہ کلام
ایک سناٹا تھا
ایک سناٹا تھا تاریک و طویل

○

آخری رات

کرسیاں، میز، فانوس، رنگین جاموں کی دلکش کھنک
بوتلیں
اپنی لمبی سُبک گردنوں میں چھپائے ہوئے
قہقہے، ہچکیاں
*ورشہ ایوں کی رنگت صراحی کے شیشوں پہ بیٹھی ہوئی
سہمی سمٹی ہوئی
کوریا کا لہو
بانکے افسروں کی نگاہوں پہ چھایا ہوا
نوجوانوں کے سینے پلیٹوں میں رکھے ہوئے
ماؤں کی چھاتیاں
تیز کانٹوں کے ناخونوں میں
ننھے بچوں کے گلرنگ رخسار امریکی چھریوں کے نیچے
اور سپاہیوں کا دل، جگر

نوکِ سنگین پر
بم کے شعلوں میں بھونا ہوا
آنسوؤں کی شراب اور چیخوں کا سنگیت
آخری رات ہے، آخری دور ہے، آخری جام ہے
دیکھو کھڑکی کے باہر ذرا جھانک کر
کوریا کی جواں رات کا جسم بارود کی طرح جلنے لگا
اور فضاؤں میں سہی پول کے چھاپہ ماروں کی آواز
کی بجلیاں ناچ اُٹھیں

○

کوریا

کوریا سُرخ اُبھرتے ہوئے سورج کی زمیں
کوریا گرم، غضبناک شعاعوں کا وطن
کوریا سینۂ مشرق میں لپکتا شعلہ
کوریا آگ اُگلتے ہوئے زخموں کا چمن

کوریا غیظ میں جلتی ہوئی بارود کی رات
ایشیا والوں کے ہر خواب کی تعبیر لئے
ایک ننھا سا مجاہد سرِ میدانِ جہاد
ساز اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں شمشیر لئے

کوریا جنگ کے بادل میں تڑپتی بجلی
کوریا امن کے پرچم کی جواں انگڑائی
کوریا لاکھوں گرجتے ہوئے نقاروں کے
شور میں ہنستی ہوئی گاتی ہوئی شہنائی

ہڈیاں خاک پہ بکھری ہیں مکانوں کی جہاں
ہاں وہیں جنگ کے راون کی چتا جلتی ہے
جس جگہ گرتا ہے پگھلے ہوئے لوہے کا لہُو
وہیں فولاد کے سانچے میں زمیں ڈھلتی ہے

سینکڑوں آنکھوں سے روتی ہیں لہُو کی بوندیں
کوریا ہنستا ہے زخموں کے دہن سے اب بھی
وادی و دشت و بیاباں پہ دھوئیں کا ہے کفن
کوریا منھ کو نکالے ہے کفن سے اب بھی

موت لاکھ آگ کے اور زہر کے بم برسائے
زندگانی تو ہٹی ہے نہ ہٹے گی ہرگز
چاہے سنگینوں کے جنگل ہوں کہ توپوں کے پہاڑ
امن کی فوج رُکی ہے نہ رُکے گی ہرگز

ذرّے دل بن کے دھڑکنے لگے میدانوں میں
پیڑ جنگل کے چلے امن کی فوجیں لے کر
بھر کے دامن میں چٹانوں کو جھپٹے ہیں پہاڑ
ندیاں بڑھتی ہیں بپھری ہوئی موجیں لے کر

بچّے آتے ہیں کھلونوں کی سجائے ہوئے فوج
عورتیں آنکھوں میں آنسو کے شرارے لے کر
ٹینکوں کا ہے ٹرکٹر کی جبینوں پہ جلال
پرچم اڑتے ہیں ہتھیلی پہ ستارے لے کر

کوریا لڑتا ہے کس جوش سے کس ہمّت سے
اب درندے نہ لہو اور بہانے پائیں
یہی انداز، یہی عزم، یہی حسنِ عمل
بدمعاش آج کہیں بچ کے نہ جانے پائیں

خونِ ناحق کی ادا کون کرے گا قیمت
زخم اِنسانوں کے ڈالر میں نہیں تُل سکتے
سات دریاؤں کا پانی بھی اگر بہہ جائے
دھبّے امریکہ کے دامن سے نہیں دُھل سکتے

کوریا کا یہ لہو جذب نہ ہو پائے گا
ایک دن اُبلے گا نیویارک کے ایوانوں میں
ایک سیلاب بغاوت کہ جو تھامے نہ تھمے
پھیلے گا لندن و پیرس کے شبستانوں میں

یاد ہے ہم کو ہر اک خون کے قطرے کا حساب
قرض اک دن یہ عدو من کو چکانا ہوگا
آج سوتے ہیں مسولینیؔ و ہٹلر جس میں
کل اُسی قبر میں ان دونوں کا ٹھکانا ہوگا

اے رکم ارسینؔ کی نظروں کی جگائی ہوئی قوم
خاک میں کون ملائے گا جوانی تیری
داستاں تیری ہر اک دل پہ لکھی جائے گی
مائیں بچوں کو سنائیں گی کہانی تیری

میرے نغمے، مرے اشعار، مری فکرِ بلند
جھک کے کرتی ہے تری جرأت و ہمّت کو سلام
میرے الفاظ، مرا جوشِ بیاں، حسنِ خطاب
لے کے آئے ہیں محبّت کا عقیدت کا پیام

میرے بچّوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی ہنسی
میری معشوقہ کے آنچل کی لرزتی ہوئی چھاؤں
سب ترے ساتھ ہیں سب، بولتے گاتے ہوئے ہونٹ
اُٹھتے لہراتے ہوئے ہاتھ تھرکتے ہوئے پاؤں

سب ترے ساتھ ہیں اے امن و محبت کے نقیب
تیرے دریاؤں میں گاتا ہوا پانی آئے
تیرے کہساروں سے کانوں کے خزانے نکلیں
تیرے کھیتوں کی بہاروں پہ جوانی آئے

کارخانوں میں ترے تیز ہوں تعمیر کے گیت
تیرے ایندھن میں جلیں قحط کے منحوس ببول
مہکیں شیراز کے خوش رنگ گلابوں کی طرح
کانپتے ہونٹوں پہ بوسوں کے کھلائے ہوئے پھول

امن کے ہاتھ سے پروان چڑھے پریم کی بیل
امن کی چھاؤں میں ہنستا رہے ماتھوں کا سہاگ
امن کے چہرے پہ چمکے ترے آکاش کا چاند
امن کے ساز میں کھو جائے ترے درد کا راگ

امن کی چھاؤں میں میداں سے سپاہی پلٹیں
سُونی گودوں میں محبت کی بہار آ جائے
باپ کو اپنے بڑھاپے کا سہارا مل جائے
ماؤں کے درد بھرے دل کو قرار آ جائے

جون سنہ ۱۹۵۱ء

فیضؔ کے نام

کل تھا جب میں جیل میں تنہا
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تری آواز کی شبنم
گھانس کے لب تر کر جاتی تھی
گُل کے کٹورے بھر جاتی تھی

شام کی رنگت بن کر اکثر
روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
چاندنی کا ملبوس پہن کر
آم اور املی کے پیڑوں پر
تھک کر جیسے سو جاتی تھی
اور میں تیرے نازک میٹھے
پیارے گیتوں کا گلدستہ
اپنے دھڑکتے دل سے لگائے
خوابوں کی نیلی وادی میں
آہستہ آہستہ چلتا
جیل سے باہر آجاتا تھا
ظُلم کے دِل پر چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
(کیسی ہے یہ قید کی دُنیا ؟
قلب و نظر کی محرومی ہے
تاریکی اور تنہائی میں
پتھر کی خاموش ہنسی ہے)

آج ہے جب تو جیل میں تنہا
میں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
یہ میری آواز ہے لیکن
صرف مری آواز نہیں ہے
جوشؔ، فراقؔ، آنندؔ اور بیدیؔ
عصمتؔ، ساحرؔ، کرشنؔ اور کیفیؔ
میری زباں سے بول رہے ہیں
ہند کے سارے لکھنے والے
ناچنے والے، گانے والے
اپنی محبت کے گلدستے
تیری جانب بھیج رہے ہیں
جلتی ہوئی یہ شاخ اٹھا لے
دیکھ اس میں کیا پھول کھلے ہیں
شعلہ، بجلی، نغمہ بن کر
بچھڑے ساتھی آن ملے ہیں

دُور ہے گو لاہور کی بستی
اونچی زنداں کی دیواریں
اک جھوٹے آئین کی سرحد
تپتا جنگل، جلتا پربت
دل اور روح کے بیچ میں حائل

پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
سانس کا زیر و بم ہے یکساں
ہم آہنگ ہے چاپ قدم کی
ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
ایک ہی لیلیٰ ایک ہی محمل
ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل
میٹھا رہے راوی کا پانی
ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں
ساون بھادوں بن کر برسیں

سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
بجتی رہے بادل کی چھاگل
دل میں ہُوک نہ اُٹھنے پائے
پیٹ میں بُھوک نہ اُگنے پائے
گیہوں کا ہر خوشہ سر پہ
زرّیں تاج پہن کر آئے
ماؤں کے سینے دُودھ سے چھلکیں
ہنستی رہیں بچّوں کی پلکیں
زُلفوں کے گہرے سائے میں
رنگ برنگے آویزوں کے
ننھے ننھے جگنو چمکیں
چُولھے دہکیں، روٹیاں مہکیں
شاخیں لہکیں، چڑیاں چہکیں
بانہیں کھنکیں، چوڑیاں گائیں
شانوں پر آنچل لہرائیں
امن واماں کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
اس مقصد کے آگے سارے

ظالم، دشمن، ڈاکو، قاتل
سہمے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
بستی بستی جنگل جنگل
ظُلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
زنجیروں کے کالے حلقے
ناگ ہیں۔ پھن پھیلائے ہوئے ہیں

ظُلم سے لیکن ڈرنا کیسا!
موت سے پہلے مرنا کیسا!
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
"بول زباں اب تک تیری ہے"
بول کہ کس قاتل کا دامن
خونِ بہاراں سے رنگیں ہے
کس کی گردن میں ڈالر کے
سونے کی زنجیر پڑی ہے
کس نے امریکہ کے ہاتھوں
خاکِ وطن کو بیچ دیا ہے
بیٹی اور بہن کے آنچل
ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے

کون ہے جو جنگی شعلوں میں
پاکستان کو جھونک رہا ہے
کون ہے جو اقبال کے دل میں
ظُلم کی کیلیں ٹھونک رہا ہے
شاعر کی آواز کو کس کا
خونیں پنجہ گھونٹ رہا ہے
ریشم کے رومال میں کس کے
رنگ لہُو کا چھوٹ رہا ہے
جیلوں کی دیواریں یہ کون
انسانوں کے دل چُنتا ہے
کون ہے جو قانون سے اپنے
مکڑی کا جالا بُنتا ہے
کون اُجالے سے خائف ہے
کون انسانوں سے ڈرتا ہے
سورج کی کرنوں سے ہراساں
جنتا کی منظروں سے پریشاں
کس نے عدالت کا دروازہ
سنگینوں سے روک دیا ہے
یہ کس نے انصاف کے مُنھ میں

ظلم کا کیڑا ٹھونس دیا ہے

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
"بول زباں اب تک تیری ہے
"تیرا ستواں جسم ہے تیرا
"بول کہ جاں اب تک تیری ہے"

اپریل ۱۹۵۱ء

سجّاد ظہیر کے نام

مجھے یقیں ہے کہ زنداں میں بھی لبوں پہ ترے
وہ موجِ نور وہ ہلکا سا اک تبسّم ہے
تری حیات سہی نفرتوں کے گھیرے میں
تری نظر میں مُحبّت بھرا تکلّم ہے

مجھے یقیں ہے کہ زنداں میں بھی خیال ترا
بنا رہا ہے نئے آدمی کی تصویریں
نیا سماج، نئی زندگی، نئی تہذیب
پہنائی جاتی ہیں جس کو ہزار زنجیریں

کھڑی ہوئی ہے ترے سر پہ موت یوں آ کر
کہ تو حیات کے پیغمبروں کا رہبر ہے
خزاں کو تیرے گلستانِ زندگی کی تلاش
کہ تیرے سینے میں دل، دل میں اک گُلِ تر ہے

اندھیرا تجھ سے خفا ہے کہ اس کے سینے پر
تجھے چراغ جلانے کی آرزو کیوں ہے
بگڑ گئے ہیں لہو کے ذلیل بیوپاری
کہ تجھ کو امن و محبت کی جستجو کیوں ہے

بلند ہوتی ہیں یوں پھانسیوں کی پھنکاریں
کہ تو نے ان کے مٹانے کا اہتمام کیا
درندے تجھ پہ جھپٹتے ہیں اس لئے مرے دوست
کہ تو نے عظمتِ انسانیت کا نام لیا

ہیں قصر چیں بہ جبیں دانت پیستے ہیں محل
کہ تیرے خواب ہیں بدحال جھونپڑوں کیلئے
ہیں جنگ باز ترے گرم خون کے پیاسے
کہ تو سکون کا پیغام ہے دلوں کے لئے

یزید و شمر کو قتلِ حسین کی ہے فکر
وہ ارضِ پاک کو بھی کربلا بنا دیں گے
ترا یہ عہد کہ انسانیت کی محفل سے
ستمگروں کا رواج ستم اٹھا دیں گے

انھیں یہ فکر کہ کھیتوں کو کس طرح لوٹیں
تجھے یہ فکر کسانوں کو کیسے چونکائیں
انھیں یہ فکر کہ کس طرح باغ بنجر ہوں
تجھے یہ فکر کہ بنجر بھی باغ ہو جائیں

انھیں یہ فکر کہ ماؤں کی جھریاں بِک جائیں
تجھے یہ فکر کہ بہنوں کے سر پہ چادر ہو
اُنھیں یہ فکر کہ زخموں سے چور چور ہوں دِل
تجھے یہ فکر کہ دُنیا گلوں کا منظر ہو

اُنھیں یہ فکر کہ تیغ و تفنگ کا ہو عُروج
تجھے یہ فکر کہ ہو خنجروں کی رُسوائی
اُنھیں یہ فکر کہ بارود کا اندھیرا چھائے
تجھے یہ فکر کہ پھیلے شفق کی رعنائی

اُنھیں یہ فکر کہ راتیں طویل ہو جائیں
تجھے یہ فکر کہ رنگِ سحر نکھر آئے
اُنھیں یہ فکر ٹھہر جائے گردشِ ایّام
تجھے یہ فکر کہ سیلابِ غم گذر جائے

جکڑ سکی نہ ارادوں کو تیرے جب زنجیر
تو قاتلانِ کہن آ گئے رسن لے کر
ترے لئے ہی نہیں ارضِ پاک کے بھی لئے
وہ آج پلٹے ہیں امریکہ سے کفن لے کر

مگر زمانے کے تیور کچھ اور ہیں، یہ رسن
کہیں اُنھیں کے گلوں کی رسن نہ بن جائے
وہ عصرِ نو کے لئے لے کے آئے تو ہیں کفن
یہ قاتلوں کا خود اپنا کفن نہ بن جائے

ذلیل و خوار ہیں وہ اور سر بلند ہے تو
جبیں کے حُسن میں اک تازہ آفتاب لیے
لبوں سے پھوٹ رہی ہے کرن تبسم کی
سحر کا نور لیے رنگِ انقلاب لیے

تری نگاہوں میں کتنے حقیر ہیں جلّاد
کہ سر سے پاؤں تلک بزدلی کے پیکر ہیں
وہ تیری آنکھوں سے آنکھیں ملا نہیں سکتے
جو ڈر رہے ہیں اسیروں سے یہ وہ جیلر ہیں

وہ آپ اپنی عدالت کو قید کرتے ہیں
ججوں کو اپنے بٹھاتے ہیں جیل خانے میں
یہ چند بھُوت جو زندہ ہیں دَورِ وحشت کے
پنپ سکیں گے نہ جمہور کے زمانے میں

تری بلندیِ فکر و نظر کا کیا کہنا
وہ دیکھ پست ہوئی جا رہی ہیں دیواریں
ہم اپنے دل کی محبت سے ڈھانپ لیں گے تجھے
ستم کے ہاتھ سے ہم چھین لیں گے تلواریں

میں پڑھ رہا ہوں لکھا ہے جبینِ وقت پہ کیا
زمانہ تجھ سے ہی انساں کے انتظار میں ہے
ہے تیرے دل میں بہاراں کی آرزو لیکن
تو آرزو کی طرح خود دلِ بہار میں ہے

مئی ۱۹۵۱ء

یلغار

(پرتھوی راج کپور کے نام)

ہم آج یلغار کر رہے ہیں
ذلیل جنگوں کے مورچوں پہ حیات کا وار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہماری عید آ گئی ہے، عالم میں جشنِ امن و اماں منائیں
پیاس کو قتل کر دیں، صدیوں کی بھوک کو قبر میں سلائیں
برہنگی کے پرانے لاشے کو آؤ مل کر کفن پہنائیں
سنوار دیں مانگ زندگی کی، زمیں کو اپنی، دلہن بنائیں
چلو کہ دنیا کے من چلوں کی برات تیار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

اب آؤ دنیا سے زرگری کا نظامِ ظلم و ستم مٹا دیں
جو ارتقا رہ میں ہمارے حائل ہیں توپ خانے انھیں ہٹا دیں
نگاہ کی بجلیوں سے بارود کے خزانوں کا دل جلا دیں
بجھا دیں خوں کے چراغ، محفل سے جامِ زہرِ اب غم اٹھا دیں
ہمیں ہے جیون سے پیار، مرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

فضائیں مسموم ہو گئیں گر، تو جنبشِ بال و پر نہ ہو گی
زمانہ تلخیٔ زہر پی لے تو زیست شیر و شکر نہ ہو گی
لہو کی بوندوں کی مسکراہٹ میں آب و تابِ گہر نہ ہو گی
سیاہ بارود کے اندھیرے سے زندگی کی سحر نہ ہو گی
سیاہیوں اور تباہیوں کی صفوں سے پیکار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

قریب ہے منزلِ تمنا تو پاؤں اپنے بہک رہے ہیں
رگوں کے اندر، خوشی سے، بیتاب خوں کے قطرے چھلک رہے ہیں
سنہرے چہرے دمک رہے ہیں سفید ماتھے دہک رہے ہیں
ہزار ہا سال کے دبے زخم آج پھر سے مہک رہے ہیں
ہم اپنے سینوں کو اپنے دل کے لہو سے گلنار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

کہاں ہیں لاؤ ہماری نازک مزاج سارنگیاں کہاں ہیں
سرود اور دلربا کی آواز کی حسین تتلیاں کہاں ہیں
ستار کے تار میں لرزتی ہوئی جواں بجلیاں کہاں ہیں
ہمارے طبلوں کے بول کی دلنواز سرمستیاں کہاں ہیں
ہم اپنی تہذیب کی حفاظت کا دل سے اقرار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

مکان، محلات، قصر، ایوان، قطار اندر قطار آئیں
کہو سفید اور سرخ پتھر کی مورتوں سے کہ مسکرائیں
کہو چراغوں سے اور چہروں کے آفتابوں سے جگمگائیں
لڑائی کی آندھیوں کی زد پر حیات کی شمع نو جلائیں
ہم آج ہر رنگ، ہر صدا، ہر ادا کو ہشیار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں
یہی تو ہے وقت اپنے سینے کی ساری بیتابیاں جگادو
جو خواب راحت میں ہیں اجنتا کی نیلی شہزادیاں، جگادو
پرانے ہندوستان کی دلفریب رنگینیاں جگادو
جگادو تہذیب اور تمدن کی ساری آبادیاں جگادو
یہی تو ہے وقت رقص و نغمہ پہ ہم جو اصرار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں
زمیں سے سنگیت کی اٹھو گنگناتے گاتے رباب لیکر
تخیّل و شاعری کے عرش بریں سے اترو کتاب لیکر
نگار خانے سے حسن کے آؤ رقص کرتا شباب لیکر
نکل پڑو عارضوں کی سرخی، نگاہ کی آب و تاب لیکر
نزاکتوں اور لطافتوں کا غرور بیدار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

بہار کی فصل ہے نہالِ مُراد بے برگ و بار کیوں ہو؟
قرار ممکن ہے جب زمانے میں پھر کوئی بیقرار کیوں ہو؟
اگر ہو آباد اپنا پہلو تو شکوۂ جورِ یار کیوں ہو؟
بھرے ہوئے میکدے میں کوئی ستم کشِ انتظار کیوں ہو؟
چڑھا کے سان اپنی پیاس کو ہم بھی آج تلوار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

زمیں کے دل میں ہماری تشنہ لبی کے شعلے دبے ہوئے ہیں
چمن چمن اپنی خوں شدہ آرزو کے غنچے کھلے ہوئے ہیں
اُداس راہوں پہ بے کفن حسرتوں کے لاشے پڑے ہوئے ہیں
قدم قدم پر ہماری ناکامیوں کے لشکر کھڑے ہوئے ہیں
ہم اپنے لشکر کو لے کے دشمن پہ آخری وار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

وہ لائیں اپنے سیہ ارادے ہم اپنے دل کی اُمنگ لائیں
ہم اپنے لوح و قلم نکالیں، وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں
ہم اپنے بربط کے تار چھیڑیں وہ شورشِ رعدِ جنگ لائیں
ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں، وہ خونِ ناحق کا رنگ لائیں
لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب جو لہو کا بیوپار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمارے گیتوں کی لے نے دُنیا میں کارِ شمشیر بھی کیا ہے
ہمارے لفظوں کے شہد و شبنم نے آتشیں جام بھی پیا ہے
ہماری نظروں نے زندگانی کا چاکِ قلب و جگر سیا ہے
ہماری ٹھوکر نے آسمان و زمیں کا محور بدل دیا ہے
ہم آج تبدیلیٔ نظامِ کہن پر اصرار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہماری زد میں ہر ایک شے ہے زمیں سے تاروں کی انجمن تک
ہماری پروازِ فکر ہے بجلیوں سے کرنوں کے بانکپن تک
ہمارے نقشِ قدم کی گلکاریاں ہیں ویرانوں سے چمن تک
ہماری تخلیق کا کرشمہ ہے سوت کے تار سے کفن تک
کہ یہ بھی اک فن ہے جنگ بازوں کی قبر تیار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

نہ ہٹلری ہی رہے گی باقی یہاں نہ اب قیصری رہے گی
فریب کی ساحری نہ اہلِ ہوس کی جادوگری رہے گی
نہ جنگ کی زرگری رہے گی نہ ظلم کی قاہری رہے گی
بس ایک محنت کی داوری اور فن کی پیغمبری رہے گی
ازل سے ہم تارِ دل سے پیدا ابد کی جھنکار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمیں نے پکڑا ہے بجلیوں کو، ہمیں نے ایٹم کے دل کو چیرا
ہمارے خونِ جگر کے رنگِ شفق سے تہذیب کا سویرا
ہمیں نے دھاتوں کی نبض پرکھی ہمیں نے ذروں کا دل ٹٹولا
ہمیں نے جنبش کا حُسن دیکھا ہمیں نے پہیوں کو رقص بخشا
قوائے فطرت کو دامِ حکمت میں ہم گرفتار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

زمیں کی گردش سے آسمانوں کی گردشوں نے بھی ہار مانی
شکار کر لی ہے دوربینوں نے ماہ و مریخ کی جوانی
تڑپتے ہاتھوں کی کارسازی میں جیسے دریاؤں کی روانی
بشر کے ذہنِ رسا میں تخلیق حسن کا سوزِ جاودانی
ہماری عظمت کا آج ارض و سما بھی اقرار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

کسی نے جادو سا کر دیا ہے بدل گیا اس طرح نظارا
سمے نے لی اک نئی جو کروٹ تو زندگی ہو گئی گوارا
پگھل کے فولاد اور توپوں نے کارخانوں کا روپ دھارا
ہے چمنیوں کا دھواں بھی پُر پیچ کاکلوں کی طرح دل آرا
یہ معجزے ہیں ہمارے ہاتھوں کے ہم جنھیں پیار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

جو برف زاروں میں ندیاں سو رہی تھیں اپنا جمال لیکر
وہ ریگزاروں کی سمت آتی ہیں آرزوئے وصال لے کر
وہ کھیتیاں ہنس رہی ہیں گودی میں حاصلِ ماہ و سال لے کر
میں آگیا ہوں خراجِ تحسین و شاعرانہ خیال لے کر
کِھلا کے لاکھوں چمن زمیں پر فضا کو گلزار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

رگوں سے انگور کی ٹپکتا ہے سُرخ افسردہ جوانی
سیاہ آنکھیں گلابی ڈوروں سے بن گئیں جام ارغوانی
دہن کے لعل و گہر خزانوں پہ اک تبسّم کی پاسبانی
دلوں کی آزاد مملکت پر فقط نگاہوں کی حکمرانی
کہ شیطنت کی حکومتوں سے دلوں کو بیزار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

وہ قدِ موزوں وہ جسم رعنا کشیدہ قامت ستار جیسے
لرزتے پیراہنوں میں رنگ بدن چمن میں بہار جیسے
بسی ہوئی بستیاں حسینوں سے دل میں تصویرِ یار جیسے
ہجوم سڑکوں پہ گا رہے ہیں پہاڑ پر آبشار جیسے
قدیم ویرانوں میں نئی بستیوں کو بیدار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

نسیمِ شیراز زلفِ بنگال کی گھٹاؤں سے کھیلتی ہے
ہوائے بخارا کی ہے جو کشمیر کی ہواؤں سے کھیلتی ہے
نگاہِ دہلی نگارِ چیں کی حسیں اداؤں سے کھیلتی ہے
صدائے پشکن[1] نوائے حافظ مری نواؤں سے کھیلتی ہے
اسیر اب تک تھیں جن میں تو میں وہ سرحدیں پار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمارے عطرِ خطا کی خوشبو سے ارضِ پیرس بسی ہوئی ہے
ہمارے دامن میں چین کے چاولوں کی چاندی بھری ہوئی ہے
تڑپتی راوی کی موج سے آج موجِ گنگا ملی ہوئی ہے
نوائے اقبال مصر و ایراں کی شاخِ گل پہ جھکی ہوئی ہے
فضائیں خونبار تھیں جہاں کی ہم ان کو گلبار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

فضاؤں میں میگھ دوت[2] اُڑتے ہیں اہلِ دل کا پیام لیکر
ہماری ٹھنڈی ہوائیں جاتی ہیں ہندیوں کا سلام لیکر
کتابیں محوِ سفر ہیں ٹیگور و بھارتی کا کلام لے کر
ہم آج اُٹھے ہیں دل کے پیمانے اور محبت کے جام لیکر
پلا کے تہذیب و امن کی مے جہاں کو سرشار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

---

[1] پشکن روس کا قومی شاعر ہے۔ جس کا زمانہ انیسویں صدی ہے۔
[2] میگھ دوت سے مراد بادل ہیں۔ اور یہ کالی داس کی مشہور نظم کا نام ہے۔

متفرّقات

○

اب آگیا ہے جہاں میں تو مُسکراتا جا
چمن کے پھول، دلوں کے کنول کھلاتا جا

عدم حیات سے پہلے عدم حیات کے بعد
یہ ایک پل ہے اسے جاوداں بناتا جا

بھٹک رہی ہے اندھیرے میں زندگی کی برات
کوئی چراغ سرِ رہ گذر جلاتا جا

گذر چمن سے مثالِ نسیم صبح بہار
گلوں کو چھیڑ کے کانٹوں کو گدگداتا جا

رہِ دراز ہے اور دُورِ شوق کی منزل
گراں ہے مرحلۂ عمر گیت گاتا جا

بلا سے، بزم میں گر ذوقِ نغمگی کم ہے
نوائے تلخ کو کچھ تلخ تر بناتا جا

سُنا کے قصۂ غم ہائے آدمی ان کو
جو ہنس رہے ہیں ذرا دیر کو رُلاتا جا
جو ہو سکے تو بدل زندگی کو خود ورنہ
نژادِ نو کو طریقِ جنوں سکھاتا جا
دِکھا کے جلوۂ فردا بنا دے دیوانہ
نئے زمانے کے رُخ سے نقاب اُٹھاتا جا
بہت دنوں سے دل و جاں کی محفلیں ہیں اُداس
کوئی ترانہ کوئی داستاں سناتا جا

○

ہم نگاہوں کو میں انداز نظر دیتا ہوں
سحر رات کو بھی رنگ سحر دیتا ہوں
بدگماں مجھ سے خزاں ہے تو تعجب کیا ہے
فصل بہاراں کی خبر دیتا ہوں

○

اک جوئے درد دل سے جگر تک رواں ہے آج
پگھلا ہوا رگوں میں اک آتش فشاں ہے آج

سینے میں ایک شعلۂ جوّالہ کی لپک
آنکھوں میں شامِ مرگِ جواں کا دھواں ہے آج

لب سی دئے ہیں تا نہ شکایت کرے کوئی
لیکن ہر ایک زخم کے منھ میں زباں ہے آج

تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو
لیکن کسی کا روئے حسیں درمیاں ہے آج

جینے کا وقت ہے یہی مرنے کا وقت ہے
دل اپنی زندگی سے بہت شادماں ہے آج

منزل کو چوم لیتی ہے اُٹھ کر نگاہِ شوق
کیا تیز گام جنبشِ عمرِ رواں ہے آج

ہنگامِ سرکشی ہے بغاوت کا وقت ہے
ہر لمحۂ حیاتِ بشر جاوداں ہے آج

ہر پائے سرفروش مری سجدہ گاہ ہے
ہر نقشِ خونِ سُرخ مرا آستاں ہے آج

ہو جاتا ہوں شہید ہر اہلِ وفا کے ساتھ
ہر داستانِ شوق مری داستاں ہے آج

آئے ہیں کس نشاط سے ہم قتل گاہ میں
زخموں سے دل ہے چور نظر گلفشاں ہے آج

زندانیوں نے توڑ دیا ظلم کا غرُور
وہ دبدبہ وہ رعبِ حکومت کہاں ہے آج

○

○

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم
جاگ اُٹھتے ہیں تو سُولی پر بھی نیند آتی نہیں
وقت پڑ جائے تو انگاروں پہ سو جاتے ہیں ہم
زندگی کو ہم سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے پیار
اور اگر مرنے پہ آ جائیں تو مر جاتے ہیں ہم
دفن ہو کر خاک میں بھی دفن رہ سکتے نہیں
لالہ و گل بن کے ویرانوں پہ چھا جاتے ہیں ہم
ہم کہ کرتے ہیں چمن میں اہتمامِ رنگ و بو
رُوئے گیتی سے نقابِ حُسن سرکاتے ہیں ہم
عکس پڑتے ہی سنور جاتے ہیں چہرے کے نقوش
شاہدِ ہستی کو یُوں آئینہ دِکھلاتے ہیں ہم
میکشوں کو مژدہ صدیوں کے پیاسوں کو نوید
اپنی محفل اپنا ساقی لے کے اب آتے ہیں ہم

○

○

تمھارے اعجازِ حُسن کی میرے دل پہ لاکھوں عنایتیں ہیں
تمھاری ہی دین میرے ذوقِ نظر کی ساری لطافتیں ہیں
جواں ہے سورج، جبیں پہ جس کے تمھارے ماتھے کی روشنی ہے
سحر حسیں ہے کہ اس کے رُخ پر تمھارے رُخ کی صباحتیں ہیں
میں جن بہاروں کی پرورش کر رہا ہوں زندانِ غم میں ہمدم
کسی کے گیسو و چشم و رخسار و لب کی رنگیں حکایتیں ہیں
نہ جانے چھلکائے جام کتنے، نہ جانے کتنے سبُو اچھالے
مگر مری تشنگی کہ اب بھی تیری نظر سے شکایتیں ہیں
میں اپنی آنکھوں میں سیلِ اشکِ رواں نہیں بجلیاں لئے ہوں
جو سربلند اور غیور ہیں اہلِ غم یہ ان کی روایتیں ہیں
میں رات کی گود میں ستارے نہیں شرارے بکھیرتا ہوں
سحر کے دل میں جو اپنے اشکوں سے بو رہا ہوں بغاوتیں ہیں
یہ شاعری عصرِ نو کی پیغمبری، زمانے کی داوری ہے
لبوں پہ میرے صحیفۂ انقلاب کی سُرخ آیتیں ہیں

○

۳۶

آندھیاں چلتی رہیں افلاک تھرّاتے رہے
اپنا پرچم ہم بھی طوفاں میں لہراتے رہے

کاٹ کر راتوں کے پربت عصرِ نو کے تیشہ زن
جوئے شیر و چشمۂ نورِ سحر لاتے رہے

کاروانِ ہمّت جمہور بڑھتا ہی گیا
شہریار و حکمراں آتے رہے جاتے رہے

رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مُدّعا
قافلوں کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے

جس قدر بڑھتا گیا ظالم ہواؤں کا خروش
اس کے کاکل اور بھی عارض پہ لہراتے رہے

پھانسیاں اُگتی رہیں زنداں اُبھرتے ہی رہے
چند دیوانے جنوں کے زمزمے گاتے رہے

○

محبت اک تڑپ ہے آرزو اک کیفیت دل کی
تری آنکھوں میں آ کر جاوداں معلوم ہوتی ہے
قدم رکتے نہیں ہیں جادۂ راہِ تمنّا میں
کہ ناکامی بھی اک سنگِ نشاں معلوم ہوتی ہے
کہیں بجلی گرے وہ اپنا گلشن ہو کہ اوروں کا
مجھے اپنی ہی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
جہاں کل میرے خونِ دل کی بوندوں کی تراوش تھی
وہی خاک آج رشکِ گلستاں معلوم ہوتی ہے
حکایت دل کی کیا، دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

○

○

نظر کے سامنے تصویرِ یار گذرے ہے
کہ مُسکراتا ہوا لالہ زار گذرے ہے
کھلائے غنچۂ دل اپنا تو اگر چاہے
زمانہ مثلِ نسیمِ بہار گذرے ہے
شکایتِ غمِ گیتی ہے زندگی کی دلیل
گذرنے دے جو اُنھیں ناگوار گذرے ہے
حیات سخت سہی پر گذر نہیں مشکل
کہ سنگِ سخت کے دل سے شرار گذرے ہے
گلوں سے کھیل رہے ہیں ہزار شعلۂ رنگ
کہ انقلابِ جہاں شعلہ بار گذرے ہے
جہاں کا رنگ بدلنے کا وقت آ پہنچا
چمن سے قافلۂ نو بہار گذرے ہے
گذر گیا یں نشیب و فراز سے جیسے
ہوائے تُند سرِ کوہسار گذرے ہے

○

○

وطن سے دور یارانِ وطن کی یاد آتی ہے
قفس میں ہم نوایانِ چمن کی یاد آتی ہے

یہ کیسا ظلم ہے پھر سایۂ دیوارِ زنداں میں
وطن کے سایۂ سرو و سمن کی یاد آتی ہے

ملاقاتوں سے پہلے اور ملاقاتوں کے بعد اکثر
کسی کے رنگ و بوئے پیرہن کی یاد آتی ہے

تصوّر جس سے رنگیں ہے تخیل جس سے رقصاں ہے
غزالِ ہند و آہوئے ختن کی یاد آتی ہے

کبھی لیلےٰ و شیریں، گاہ ہیر و سوہنی بن کر
نرالے یار کی، بانکے سجن کی یاد آتی ہے

کہاں کا خوفِ زنداں، دہشتِ دار و رسن کیسی
قدِ معشوق و زلفِ پرشکن کی یاد آتی ہے

ستاتی ہے محل میں یادِ کافور و کفن اُن کو
ہمیں زنداں میں بھی تیغ و کفن کی یاد آتی ہے

اُنھیں اب انجمن میں بھی ہے اک احساسِ تنہائی
ہمیں تنہائی میں بھی انجمن کی یاد آتی ہے

○

مستیٔ رندانہ ہم، سیرابیٔ میخانہ ہم
گردشِ تقدیر سے ہیں گردشِ پیمانہ ہم

خونِ دل سے چشمِ تر تک، چشمِ تر سے تا بہ خاک
کر گئے آخر گل و گلزار ہر ویرانہ ہم

کیا بلا جبرِ اسیری ہے کہ آزادی میں بھی
دوش پر اپنے لئے پھرتے ہیں زنداں خانہ ہم

راہ میں فوجوں کے پہرے سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی با سطوتِ شاہانہ ہم

مٹتے مٹتے دے گئے ہم زندگی کو حسن و رنگ
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

یا جگا دیتے ہیں ذرّوں کے دلوں میں میکدے
یا بنا لیتے ہیں مہر و ماہ کو پیمانہ ہم

قید ہو کر اور بھی زنداں میں اڑتا ہے خیال
رقصِ زنجیروں میں بھی کرتے ہیں آزادانہ ہم

ہے ہمیں سے اب عبارت زندگی کی داستاں
شوخیٔ عنوانِ ہستی، سرخیٔ افسانہ ہم

ایک پل میں اب ہماری ہی ہے یہ بزمِ نشاط
آ رہے ہیں لے کے دل میں جراتِ رندانہ ہم

وجد میں ہے بزمِ گیتی، رقص میں ہے کائنات
شاعری کو جانتے ہیں نعرۂ مستانہ ہم

○

○

نئے زمان و مکاں، انقلاب زندہ باد
نئی ہے عمرِ رواں، انقلاب زندہ باد
حیات اب ہے سُبک سیر و آسماں پرواز
کہاں کا بارِ گراں، انقلاب زندہ باد
یقین رہبرِ منزل، یقین سالکِ راہ
نہ وہم ہے نہ گماں، انقلاب زندہ باد
غموں کا بار اُٹھائے سفینہ ہائے نجات
دلوں کی جوئے رواں، انقلاب زندہ باد
دہک رہی ہیں فضائیں چمک رہے ہیں اُفق
بلند شعلۂ جاں، انقلاب زندہ باد
قدم ہیں نغمہ گر و نغمہ ریز و نغمہ فشاں
زمیں ہے رقص کناں، انقلاب زندہ باد
کرن جو روس سے پھوٹی تو چین میں چمکی
کہاں سے آئی کہاں، انقلاب زندہ باد

بنی ہوئی ہے دُلہن سرزمینِ شنگھائی
حسین و شوخ و جواں، انقلاب زندہ باد
ہر ایک گام پہ بے مثل عظمتوں کی دلیل
شہادتوں کے نشاں، انقلاب زندہ باد
کہاں سے لائے گی غیروں کی تیرہ اندیشی
مری زبان و بیاں، انقلاب زندہ باد

وفورِ شوق کی رنگیں حکایتیں مت پوچھ
لبوں کا پیار، نگہ کی شکایتیں مت پوچھ

کسی نگاہ کی نس نس میں تیرتے کانٹے
وہ ابتدائے محبت کی راحتیں مت پوچھ

وہ نیم شب، وہ جواں حسن، وہ وفورِ نیاز
نگاہ و دل نے جو کی ہیں عبادتیں مت پوچھ

ہجومِ غم میں بھی جینا سکھا دیا ہم کو
غمِ جہاں کی ہیں کیا کیا عنایتیں مت پوچھ

یہ صرف ایک قیامت ہے جبیں کی کروٹ
دبی ہیں دل میں ہزاروں قیامتیں مت پوچھ

بس ایک حرفِ بغاوت زباں سے نکلا تھا
شہید ہوگئیں کتنی روایتیں مت پوچھ

اب آج قصۂ دارا و جم کا کیا ہوگا
ہمارے پاس ہیں اپنی حکایتیں مت پوچھ

نشانِ ہٹلری و قیصری نہیں ملتا
جو عبرتوں نے لکھی ہیں عبارتیں مت پوچھ
نشاطِ زیست فقط اہلِ غم کی ہے میراث
ملیں گی اور ابھی کتنی دولتیں مت پوچھ

○

○

دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے
بہے پسینہ مکھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے
من اک ننھا سا بالک ہے ہمک ہمک رہ جائے ہے
دور سے مکھ کا چاند دکھا کر کون اسے للچائے ہے
مے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے

تیرے قامت کی لرزش سے موجِ مے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے
تیرا درد سلامت ہے تو مرنے کی اُمید نہیں
لاکھ دُکھی ہو، یہ دُنیا رہنے کی جگہ بن جائے ہے

○

زمیں کے سینے میں جذب ہو کر رہا نہ خونِ وفا شعاراں
کھلے جو غنچے ہنسیں جو کلیاں تو مُسکرائے رُخِ نگاراں
فضا کے پہلو میں کھُل کے انگڑائی لی شفق رنگ پرچموں نے
صدائیں آئیں کہ ہو رہی ہے سحر شبِ تیرہ روزگاراں
دعائیں دیتی ہے چین کی فوج کو شکستہ دلوں کی دھڑکن
یہ لشکرِ انقلاب پرچم ہے لشکرِ اہرمن شکاراں
یہ کس نگارِ بہار پیکر نے اپنا دامن جھٹک دیا ہے
مہک رہے ہیں چمن ہزاروں، چمن چمن رنگِ نو بہاراں

○

مری محبت کی کوئی قیمت نہیں۔ ہے کوئی صلہ نہیں ہے
مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے کوئی گلہ نہیں ہے
میں اپنے مجبور دل کے ہاتھوں کچھ اتنا مجبور ہو گیا تھا
میں تم کو اپنی طرح کا انساں سمجھ کے مسحور ہو گیا تھا
خبر نہ تھی پتھروں کے سینے میں دل بناتا رہا ہوں ابتک
میں برف کی سِل پہ اپنی چنگاریاں لٹاتا رہا ہوں ابتک
میں گیت گاتا رہا ہوں ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ستار لیکر
رہا ہوں میں بیقرار اکثر تمھیں خود اپنا قرار دے کر
مری محبت، مری عقیدت کا اب مجھے یہ صِلہ ملا ہے
کہ میرے زخمِ جگر کو میرے ہی تارِ دل سے سیا گیا ہے
اگر کوئی اور میرے عہدِ وفا کا آئینہ دار ہوتا
اگر تمھاری جگہ، کوئی اور دوسرا غمگسار ہوتا
تو میں اسے اپنی روح سے اپنے دل سے باہر دھکیل دیتا
میں اس کے سر پر حقارتوں کے جہنموں کو اُنڈیل دیتا
مگر میں اب تم کو کیا کہوں میری روح و دل کا سُرور ہو تم
مجھے اندھیرا ابھی دو تو خوش ہوں کہ میری آنکھوں کا نور ہو تم

○

وہ مری دوست وہ ہمدرد وہ غم خوار آنکھیں
ایک معصوم محبت کی گنہ گار آنکھیں
شوخ و شاداب و حسیں، سادہ و پُرکار آنکھیں
مست و سرشار و جواں، بیخود و ہشیار آنکھیں
ترچھی نظروں میں وہ اُلجھی ہوئی سُورج کی کرن
اپنے دزدیدہ اشاروں میں گرفتار آنکھیں
جنبشِ ابرو و مژگاں کے خنک سائے میں
آتش افروز، جنوں خیز، شرر بار آنکھیں
کیفیتِ دل کی سُناتی ہوئی ایک ایک نگاہ
بے زباں ہو کے بھی وہ مائلِ گفتار آنکھیں
موسمِ گل میں وہ اُڑتے ہوئے بھونروں کی طرح
غنچۂ دل پہ وہ کرتی ہوئی یلغار آنکھیں
کبھی چھلکی ہوئی شربت کے کٹوروں کی طرح
اور کبھی زہر میں ڈوبی ہوئی تلوار آنکھیں
کبھی ٹھہری ہوئی یخ بستہ غموں کی جھیلیں
کبھی سہما ہوا، سمٹا ہوا اک پیار آنکھیں

کبھی جھکتے ہوئے بادل کبھی گرتی بجلی
کبھی اُٹھتی ہوئی آمادۂ پیکار آنکھیں

نوکِ ابرو میں کبھی تلخیٔ انکار لئے
کبھی گھولے ہوئے شیرینیٔ اقرار آنکھیں

آنچ میں اپنی جوانی کی سُلگتی چتون
شبنمِ اشک میں دھوئی ہوئی گلنار آنکھیں

حُسن کے چاند سے مکھڑے پہ چمکتے تارے
ہائے آنکھیں وہ حریفِ لب و رُخسار آنکھیں

عشوہ و غمزہ و انداز و ادا پر نازاں
اپنے پندارِ جوانی کی پرستار آنکھیں

رُوح کو روگ محبت کا لگا دیتی ہیں
صحتِ دل جو عطا کرتی ہیں بیمار آنکھیں

صحنِ زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا ہجوم
شمع کی طرح فرِ زنداں سرِ دیوار آنکھیں

○

○

عطرِ فردوس جواں میں یہ بسائے ہوئے ہونٹ
خونِ گلرنگِ بہاراں میں نہائے ہوئے ہونٹ
خود بخود آہ لرزتے ہوئے بوسوں کی طرح
میرے ہونٹوں کی لطافت کے جگائے ہوئے ہونٹ
دستِ فطرت کے تراشے ہوئے دو برگِ گلاب
دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے بنائے ہوئے ہونٹ
ظلم اور جبر کے احکام سے خاموش مگر
مُہرِ پیمانِ محبت کی لگائے ہوئے ہونٹ

○

○

ہماری پیاری زبان اردو
ہماری نغموں کی جان اردو
حسین دلکش جوان اردو
زبان وہ دھل کے، جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زبان میں ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
جوان ہو کر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہیں ہیں
اسی زباں کے چمکتے ہیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں

اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب[۵۱] پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خود سری کا جواب پایا
اسی سے میری جواں تمنا نے شاعری کا رباب پایا
یہ اپنے نغمات پُر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
ستمگروں کی ستمگری پر ہزار ہا وار کر چکی ہے
کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے جہاں ہم جھجک گئے ہیں
وہ کونسی رزم گاہ ہے جس میں اہل اردو دبک گئے ہیں
وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میداں میں آئے ہوں اور ٹھٹھک گئے ہیں
یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں[۵۲] کی تیرگی کے دیے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فرازِ دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی[۵۳] کے گیت گائے
کہا ہے کس نے ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھن جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے
یہ کیسی بادِ بہار ہے جس میں شاخِ اردو نہ پھل سکے گی

---

۵۱ "انقلاب زندہ باد" تحریکِ آزادی کا سب سے مشہور نعرہ اردو زبان ہی کی دین ہے۔

۵۲ اردو کے درجنوں ادیب اور شاعر قیدِ فرنگ میں رہ چکے ہیں۔

۵۳ سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

وہ کیسی بہار روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہیئے جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی
ہمیں یہ حق ہے ہم اپنی خاکِ وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخِ گل تو پھر کیوں نہ اس پہ ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں
کہاں ہو متوالو آؤ بزم وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زبان کی زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا
ہماری اردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستاں ہمارا
چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم ہوائے بہار بن کر
ہمالیہ سے اُتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سُرخ دھار بن کر

o

غزل

(ہند پاک مشاعرے کے موقع پر کہی گئی)

پھر شمیمِ گل نویدِ جانفزا لائی ہے آج
میرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آئی ہے آج

پھر اُٹھا ہے وادیٔ گنگا سے ابرِ نو بہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج

آج پھر ہے اتحادِ شیشہ و ساغر کا دور
محفلِ رنداں میں جشنِ بادہ پیمائی ہے آج

چشمِ ساقی تجھ میں سارا میکدہ آباد ہے
قامتِ رعنا میں موجِ مے کی انگڑائی ہے آج

کھل گئے ہیں اشتیاقِ دید میں آنکھوں کے در
دوستوں کی خانۂ دل میں پذیرائی ہے آج

"آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"
شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج

پھر وہی گلیاں وہی اگلا طوافِ کوئے دوست
عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رسوائی ہے آج

کون ہے جس سے سنبھالا جائے گا میرا جنوں
خود ہی پائے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج

ڈر رہا ہوں جان و تن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ
میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج

آج بیباکی میں ہے اہلِ خرد کی مصلحت
سر فروشی ہی میں اہلِ دل کی دانائی ہے آج

مسکرائے زخمِ دل، ہنسنے لگے سینے کے داغ
روحِ استبداد کیسی کیسی شرمائی ہے آج

خونِ ناحق لالہ و گل بن کے پھوٹا خاک سے
تیشہ زن کے خوں سے دشت و در کی زیبائی ہے آج

کہہ دو صیادوں سے، گلچینوں کو کر دو ہوشیار
فصلِ گل نے دور تک زنجیر پھیلائی ہے آج

ہاں یہی ہے روزِ محشر، ہاں یہی روزِ حساب
تیری رسوائی ہے اب یا میری رسوائی ہے آج

پھر ہے میناروں پہ رعشہ، پھر ہیں گنبد سرنگوں
پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے ٹکرائی ہے آج
آج پھر قدموں پہ میرے جھک رہی ہے کائنات
میرے قبضے میں جہانِ نو کی دارائی ہے آج
خاک پر جھکتی نہیں افلاک پر رکتی نہیں
جو نگہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج
ایک ساحل ہے کہ ابھرا ہے بھنور کی گود سے
ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے ٹکرائی ہے آج
رنگِ مے، حسنِ نگاراں، جشنِ گل، فصلِ بہار
ہند کی روحِ جواں شعروں میں کھنچ آئی ہے آج
جل اٹھا نبضوں میں خوں روشن ہوئے دل میں چراغ
شاعرِ آتش نوا نے آگ برسائی ہے آج

○

اناج

میری عاشق ہیں کسانوں کی حسیں کنیائیں
جن کے آنچل نے محبت سے اُٹھایا مجھ کو
کھیت کو صاف کیا، نرم کیا مٹی کو
اور پھر کوکھ میں دھرتی کی سُلایا مجھ کو
خاک در خاک ہر اک تہہ میں ٹٹولا لیکن
موت کے ڈھونڈھتے ہاتھوں نے نہ پایا مجھ کو
خاک سے لے کے اُٹھا مجھ کو مرا ذوقِ نمو
سبز کونپل نے ہتھیلی میں چھپایا مجھ کو
موت سے دُور مگر موت کی اک نیند کے بعد
جنبشِ بادِ بہاری نے جگایا مجھ کو
بالیاں پھولیں تو کھیتوں پہ جوانی آئی
ان پریزادوں نے بالوں میں سجایا مجھ کو
میرے سینے میں بھرا سُرخ کرن نے سونا
اپنے جھُولے میں ہواؤں نے جھُلایا مجھ کو

میں رکابی میں، پیالوں میں مہک سکتا ہوں
چاہیئے بس لبِ رخسار کا سایہ مجھ کو

میری عاشق ہیں کساوتں کی حسیں کنیائیں
گود سے ان کی کوئی چھین کے لایا مجھ کو
ہوسِ زر نے مجھے آگ میں پھُنکا ہے کبھی
کبھی بازار میں نیلام چڑھایا مجھ کو
قید رکھا کبھی لوہے میں کبھی پتھر میں
کبھی گوداموں کی قبروں میں دبایا مجھ کو
سی کے بوروں میں مجھے پھینکا ہے تہہ خانوں میں
چور بازار کبھی راس نہ آیا مجھ کو
وہ ترستے ہیں مجھے اور میں ترستا ہوں اُنھیں
جن کے ہاتھوں کی حرارت نے اُگایا مجھ کو

کیا ہوئے آج مرے ناز اُٹھانے والے؟
ہیں کہاں قیدِ غلامی سے چھُڑانے والے

○

غزل

گرم ہے اب کی بہت گرم ہوائے کشمیر
دہکی دہکی نظر آتی ہے فضائے کشمیر

جانے کس پر یہ نگاہِ غلط انداز پڑے
بہکی بہکی سی ہے کچھ دن سے ادائے کشمیر

چند سِکّوں میں بِکی تھی یہ کبھی کشتِ بہار
چند سکّے ہی ہیں کیا اب بھی بہائے کشمیر؟

ظلم عُریاں تو نہیں سازشِ پنہاں ہے مگر
آہ کیا اب بھی فرنگی ہے خدائے کشمیر؟

ورقِ گل کو مسل ڈالا ہے کس ظالم نے
پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے ردائے کشمیر

کوئی بتلائے کہ یہ بھوک یہ افلاس ہے کیوں
شیر و شہد و ثمر و گل ہے عطائے کشمیر

جانے فریادِ جگر دوز بنے گی کب تک
نالۂ زیرِ لبی تک ہے نوائے کشمیر

اس طرف سے بھی گذر قافلۂ صبح بہار
راس آتی ہے بہاروں کو ہوائے کشمیر

○

تہنیت

اے سرزمینِ کاشمر شاعر کی فردوسِ نظر
جنّت کی تصویرِ حسیں آباد روئے خاک پر
ہر شاخ شاخِ گل ہے یاں ہر شاخِ گل شاخِ ثمر
اے سرزمینِ کاشمر

نیلم کے کہساروں کے دامن میں زمرّد کی زمیں
موتی کی جھالر سے حسیں، موجِ رواں کی آستیں!
بہتے ہوئے دریاؤں میں پگھلے ہوئے شمس و قمر
اے سرزمینِ کاشمر

سونا اگلتی ہے زمیں چاندی لٹاتی ہے فضا
پی کر شرابِ لالہ گوں وادی میں آتی ہے ہوا
گویا شرابِ ارغواں کے جام ہیں گلہائے تر
اے سرزمینِ کاشمر

یاں ذرّے ذرّے کے لئے فطرت کی دولت عام ہے

ہر سنگ کو انعام ہے ہر خشت کو اکرام ہے
انساں کی قسمت میں مگر، دردِ دل و داغِ جگر
اے سرزمینِ کاشمر

پتھر کے ٹیلوں کو ہوا ملبوس برفانی عطا
بے جاں مناظر کے لئے بھی سبزہ و گل کی قبا
عریاں بدن لیکن ترے نورِ نظر، لختِ جگر
اے سرزمینِ کاشمر

دولت کے سائے میں مگر مجبور و معذور و فقیر
آزاد و خود مختار لیکن دامِ سازش میں اسیر
قومِ شریف و چرب دست و تر دماغ و باہُنر
اے سرزمینِ کاشمر

دُھندلی نظر آتی ہیں کچھ رنگین و روشن وادیاں
پڑتی ہیں شاید دُور سے نیویارک کی پرچھائیاں
پوشیدہ زیرِ شاخِ گل تیر و سناں، تیغ و تبر
اے سرزمینِ کاشمر

ہاں بِک نہ جائے دیکھنا تیرے شہیدوں کا لہُو
ہاں لُٹ نہ جائے کشتِ گل، ہاں اُڑ نہ جائے رنگ و بُو
ہاں تُل نہ جائے ڈالروں کے ڈھیر میں شاخِ ثمر
اے سرزمینِ کاشمر

بدلی نظر آتی ہے کچھ مشرق کے باغوں کی ہوا
ہے بھیرویں کی تان سے گونجی ہوئی ساری فضا
چہکیں گے تیرے باغ میں کب نغمہ سنجانِ سحر
اے سرزمینِ کاشغر

پہلو میں ارضِ سوویت، انسانیت کی پاسباں
اور سر کے اوپر انقلابِ چیں کا دستِ مہرباں
ہیں منتظر کب سے تری یلغار کے فتح و ظفر
اے سرزمینِ کاشغر

گنگ و جمن کی تہنیت لایا ہوں تیرے واسطے
جمہوریت کی راہ میں ملتے ہیں سارے راستے
ہر کاروانِ شوق کی ہے ایک منزل اک ڈگر
اے سرزمینِ کاشغر

○

پیامِ کشمیر

سُنا دے کوئی پیامِ کشمیر سامراجی مُدبّروں کو
تمھاری محفل میں راہزن پیشہ، جنگ جو، راہبر بہت ہیں

تمھیں خبر کیا ابھی ہماری طویل قامت بلندیوں کے
حسین اور دلنواز منظر ہیں، راستے پُرخطر بہت ہیں

ہمارے شبنم سے تر شگوفوں کو تم نے چھیڑا تو جل مروگے
کہ زیرِ دامانِ سُرخیٔ گل بہت ہیں شعلے، شرر بہت ہیں

ہمیں نہ للچاؤ خوں میں لتھڑے ذلیل ڈالر کا مُنھ دِکھا کر
بہت ہیں آنسو ہمارے دل میں، ہتھیلیوں میں گہر بہت ہیں

ہم اپنی محنت سے آپ اپنے چمن کی قسمت سنوار لیں گے
بہت ہے بازو میں زور، جنبش میں انگلیوں کی ہُنر بہت ہیں

حُسنِ کشمیر

آباد ہے خوابوں کی طرح وادیٔ کشمیر
فانوس ہیں تاروں کے تو پھولوں کے چراغاں
دامن میں پہاڑوں کے لہکتی ہیں بہاریں
پتھر کی ہتھیلی پہ مہکتا ہے گلستاں
"سنتور" بجاتی ہوئی پھرتی ہیں ہوائیں
ہر باغ میں آوارۂ و سرمست و غزلخواں
اُڑتی ہوئی آتی ہیں پرستانِ اُفق سے
ملبوسِ شفق پہنے ہوئے صبح کی پریاں
ہر وادیٔ شاداب ہے محبوبۂ گلفام
معشوقۂ نوخیز ہے ہر جوئے کہستاں

"سنتور" ——— کشمیر کا قومی ساز ہے۔

جھیلیں ہیں کہ نیلم کے تراشے ہوئے پیالے
فوارے ہیں یا گوہر و الماس ہیں رقصاں
"شالی" کے ہیں یہ کھیت کہ سبزے کے سمندر
سائے ہیں چناروں کے کہ جنّت کے شبستاں
دوشیزۂ کہسار، پہاڑوں کی غزالہ
بنتِ مہ و خورشید ہے ہر دخترِ دہقاں
چھین لے دل وہ ہُنرِ دستِ ہنرمند
انمول مگر جنس کے بازار ہیں ارزاں
اخلاص و محبّت کی وہ گوندھی ہوئی مٹی
اخلاق و مروت کے وہ ڈھالے ہوئے انساں
بخشا ہے انہیں جہدِ مسلسل کے عمل نے
وہ ذوقِ لطافت کہ ہے پروردۂ طوفاں
شاعر کو یقیں ہے کہ نکھر آئے گا اک روز
وہ حُسن جو افلاس کی چادر میں ہے پنہاں

"شالی" ـــــ کشمیری زبان میں دھان کو "شالی" کہتے ہیں۔

جہلم کا ترانہ

مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں
ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں

وادی میں لہراتا ہوا
سبزے سے اٹھلاتا ہوا
سو پیچ و خم کھاتا ہوا
ہنستا ہوا گاتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

موجوں کی زلفیں کھولتا
قطروں کے موتی رولتا
معشوقۂ کشمیر کے
پہلو میں اتراتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

الماس پاش، انجم فشاں
پیراہنِ آبِ رواں
دوشیزۂ مہتاب کو
آئینہ دکھلاتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

کھیتوں کے دامن میں یہاں
باغوں کے سائے میں وہاں
اپنی شرابِ ناب کے
ساغر کو چھلکاتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

جو ذرّہ ہے سیراب ہے
جو خاک ہے شاداب ہے
خونِ بہارِ جاوداں
رگ رگ میں دوڑاتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں

مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

مثلِ بُتانِ سیم تن
وادی بہ وادی گام زن
موجِ نسیمِ صبح کی
جنبش کو شرماتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

فطرت مری وارفتگی
آزادگیٔ و سرکشی
طوفاں سے ملتا ہوں گلے
ساحل سے ٹکراتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

آسودگیٔ جسم و جاں
آغوشِ بحرِ بیکراں
شوریدگی کو عشق کے
آداب سکھلاتا ہوا

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانندِ جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں